سر سید احمد خان اور فرانسز بیکن کے منتخب مضامین کا فکری و فنی تقابل

مقالہ برائے ایم۔فل (اُردو)

مقالہ نگار

سمیرا ایوب

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۱۹ء

©

سر سید احمد خان اور فرانسز بیکن کے منتخب مضامین کا فکری و فنی تقابل

مقالہ نگار

سمیرا ایوب

یہ مقالہ

ایم فل (اُردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگوئجز

(اُردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز، اسلام آباد

جنوری ۲۰۱۹ء

©

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف ہائیر لینگوئجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **سرسید احمد خان اور فرانسز بیکن کے منتخب مضامین کا فکری و فنی تقابل**

پیش کار: سمیرا ایوب رجسٹریشن نمبر:1207/Mphil/URD/S16

ماسٹر آف فلاسفی

شعبہ: شعبہ زبان و ادب اردو

ڈاکٹر ڈاکٹر روبینہ شہناز
نگران مقالہ

عاصم خان
(لیکچرار شعبہ انگریزی)
شریک نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد سفیر اعوان
ڈین فیکلٹی آف لینگوئجز

بریگیڈئر محمد ابراہیم
ڈائریکٹر جنرل

تاریخ

اقرار نامہ

میں سمیرا ایوب حلفیہ بیان کرتی ہوں اس مقالے میں پیش کیا گیا مواد میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگوئجز اسلام آباد کے ایم فل اُردو سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر روبینہ شہناز کی نگرانی میں کیا گیا ہے۔میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گی۔

سمیرا ایوب

مقالہ نگار

فہرست ابواب

مقالے کے دفاع اور منظوری کا فارم	III
اقرار نامہ	IV
فہرست ابواب	V
مقالے کا دائرہ کار	VII
Abstract	IX
مقالے کا مقصد	XI
اظہارِ تشکر	XII
باب اول: اصولی مباحث	۱
الف) موضوع کا تعارف	۱
ب) نثر	۵
ج) مضمون کیا ہے	۶
د) ادب کیا ہے	۱۲
ہ) اردو میں ادبی مضمون نگاری کی روایت	۱۵
) مغرب میں تقابل کی روایت	۲۵
۔ حوالہ جات	۴۶
باب دوم: سر سید احمد خان ایک تعارف	۴۸
الف) تعارف	۴۸
ب) سر سید احمد خان کے مضامین کا فکری جائزہ	۵۸
ج) سر سید کے مضامین کا فنی جائزہ	۶۸
۔ حوالہ جات	۸۱

باب سوم:	فرانسز بیکن کے منتخب مضامین کا جائزہ	۸۲
الف)	تعارف	۸۲
ب)	بیکن کا ادبی اور سیاسی و معاشرتی سفر	۸۷
ج)	فرانسز بیکن کے مضامین کا فکری جائزہ	۸۹
د)	فرانسز بیکن کے مضامین کا فنی جائزہ	۱۰۴
۔	حوالہ جات	۱۲۱
باب چہارم:	فرانسز بیکن اور سر سید احمد خان کے مضامین کا تقابل	۱۲۲
الف)	موضوعات کا تقابلی جائزہ	۱۲۲
ب)	رسوم ورواج کا فلسفہ اور اس میں اصلاح کی ضرورت	۱۳۲
ج)	مذہب اور معاشرت	۱۳۷
د)	مضامین کا اسلوبیاتی تقابل	۱۳۸
۔	حوالہ جات	۱۶۰
باب پنجم:	مجموعی جائزہ، نتائج وسفارشات	۱۶۱
۔	نتائج	۱۶۹
۔	سفارشات	۱۷۰
	کتابیات	۱۷۱

مقالے کا دائرہ کار

اردو نثر کی سب سے ابتدائی صورت مضمون ہے۔ اپنے خیالات اور جذبات کو تحریری شکل میں عوام الناس کے سامنے پیش کرنے کو مضمون کہتے ہیں۔ مضمون کا دامن اتنا وسیع ہے کہ اس میں ذروں سے لے کر ستاروں تک کی دنیا سما سکتی ہے۔ یعنی مضمون میں ہم کسی بھی چیز، واقعہ یا موضوع پر تفصیلی طور پر اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں۔ مضمون نویسی کا آغاز فرانسیسی زبان سے ہوا اور وہاں سے تحریری ادب میں وارد ہوا۔ انگریزی میں باقاعدہ طور پر فرانسز بیکن نے اس صنف نثر کو پروان چڑھایا اور رفتہ رفتہ اس میں جدت آتی گئی۔ اردو ادب میں سر سید احمد خان نے سب سے پہلے مضمون نویسی کا آغاز کیا۔ سر سید احمد خان نے لندن کا سفر کیا وہاں انہوں نے "سپیکٹیٹر اور ٹیٹلر" میں شائع ہونے والے مضامین کا مطالعہ کیا جس سے وہ بہت متاثر ہوئے اور واپس آکر اپنے رسالے (تہذیب الاخلاق) کا اجراء کیا۔ جس میں ان کے اردو مضامین شائع ہوا اور یوں اردو ادب کے سب سے اولین مضمون نگار کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔

فرنسز بیکن انگریزی کے اولین نثر نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ بیکن نے ایک طویل سیاسی زندگی گزاری اور اسے مختلف طرح کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جس سے اس کی ذہنی اور نفسیاتی صلاحیتوں میں اضافہ ہوا۔ چنانچہ ان کے مضامین میں انسانی رویوں پر مفصل تبصرے ملتے ہیں۔ بیکن نے مضمون نگاری میں اعلیٰ علمی اور ادبی زبان استعمال کی اس لیے ادب سے شغف نہ رکھنے والوں کے لیے اس کی باتوں کو سمجھنا آسان نہ تھا۔ بیکن کے مضامین فکری و فنی لحاظ سے اتنے بے داغ ہیں کہ انہیں ادب کے کسی بھی فن پارے کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔

ادب انسانیت کی اشائیت کے سفیر ہیں چنانچہ دنیا کی مختلف زبانوں کے ادب کا موازنہ انسانیت کے بہترین مفاد میں ہے۔ اس سے انسانی نظریات مجموعی طور پر قدم بہ قدم آگے پڑھتے ہیں۔ تقابلِ ادب کا وہ ذریعہ ہے جس میں اس بات کا پتا بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس کے دوسری زبانوں پر اثرات کیوں اور کیسے مرتب ہوسکتے ہیں۔ میں نے اپنی تحقیق کا باقاعدہ آغاز درج ذیل ابواب بندی کے مطابق کیا ہے۔

۱۔ اس مقالے کے پہلے باب میں مضمون نگاری کی روایت و مفہوم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۲۔ مقالے کے باب دوم میں سر سید احمد خان کے تعارف اور ان کی مضمون نگاری کا فکری و فنی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

۳۔ مقالے کے باب سوم میں فرانسز بیکن کا تعارف اور ان کے انگریزی مضامین کا فکری و فنی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

۴۔ باب چہارم میں دونوں مضمون نگاروں کے مضامین کا تقابل کیا جائے گا۔

۵۔ باب پنجم مجموعی جائزہ پر مشتمل ہو گا۔

ABSTRACT

The scope of the subject is broad it can cover each and every part of the universe world. In essay, we can express our thoughts about everything. Essay writing originated started from French language and then transferred to English language.

Farncis Beacon priority by push its growth in English and with the pessage of time it took new dionessions. Sir Syed Ahmed Khan first started essay writying in Urdu. Sir Syed Ahmed Khan travelled to London where studied eassies in "Spectator and Tetlor" from which he. Inspired very much and on his return he published Magzine, Tehzib-ul-Ikhlaq. In which his Urdu essay published. In such a way he baceme famous in Urdu literature as top most essay.

Francis Beacon is known as English first writer. Francis has spent a long political life and met with different type of people which boosted up his mental and psychological capabilities. Resultantly, comprehensive debates on woman attilnes can be found. Beacon used excellent educational and literary language in his essay writing. That was the reason that ordinary people could not understand his words easily.

Bacon's intellectual and artistic essays are so effective that it can counter every other's literature essays. Literature is the shared asset of all humans and all literatures are the embassador of humanity. So, the comparison of different literature is in the favour of humanity.

Literature problems human ideologies collectively. Comparison of writters is that source which sortout that now and why it affect and influence other literature. I started my research according to the following chapters.

1. The first chapter sheds light the traditions and meanings of essay writing.

2. In second chapter I introduced Sir Syed Ahmad Khan and investigated his intellectual and Artistic essay writing.
3. In third chapter, I introduced Sir Bacon and investigated his intellectual and Artistic essay writing in English.
4. In forth chapter 10, 10 essays of Sir Syed Ahmad Khan and Sir Bacon has been compared.
5. In fifth chapter some recommendation and a complete overview has been given.

مقالے کا مقصد

سرسید احمد خان اُردو ادب کی ان عظیم شخصیات میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے اردو ادب کو ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ادب اُردو میں یہ عظیم تحویل ان کی بلند فکری کے سبب رونما ہوئی۔ سرسید احمد خان اٹھارویں صدی میں پیدا ہونے والے ان مسلمان رہنماوؤں میں سے ایک ہیں جنھوں نے مسلمانوں میں ایک مقصد کے تحت متحد ہونے کے جذبے کو بیدار کیا اور نئے زمانے کے چیلنجوں کو نئے دستور سے نمیٹنے میں ان کی رہنمائی کی۔

سرسید کی مضمون نگاری ایک بہت وسیع وعریض موضوع ہے۔اس صنف ادب کو انھوں نے مخصوص مقاصد کے حصول کے لیے پوری ایمانداری سے استعمال کیا۔سرسید نے اس سلسلے میں دیگر انگریز انشاء نگاروں کے ساتھ ساتھ بیکن سے بالخصوص بہت زیادہ اثر قبول کیا۔بیکن انگریزی ادب کا وہ ادیب ہے۔جس نے انگریزی ادب میں مضمون جیسی گری پڑی صنف کو بلندی کی عظمت سے ہمکنار کیا۔سرسید نے اپنے بلند مقصد کے حصول کے لیے ان کے افکار سے نہ صرف مدد لی بلکہ اکثر اوقات انہیں کے بیان کردہ نکات کو برصغیر کے باسیوں کی رہنمائی کے لیے اپنے نقطہ نظر کے ساتھ پیش کرنے کی جرات کی۔اس مقالے کے ذریعے جن مقاصد کے حصول کی کوشش کی گئی ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ تقابلی ادب کے پہلو سے سر فرانسسز بیکن اور سرسید احمد خان کی مضمون نگاری کی جانچ۔

۲۔ معاشرتی وسیاسی فرق کے تناظر میں دونوں ادیبوں کے انداز فکر کی تبدیلی کا بیان۔

۳۔ فکری، فنی، موضوعاتی واسلوبیاتی لحاظ سے ہر دو مضمون نگاروں کا جائزہ لے کر مماثلت اور افتراق کی وجوہات کا پتہ کرنا۔

اظہارِ تشکر

سر سید احمد خان تحریک پاکستان کی خشت اوّل قرار دیے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ جن حالات وواقعات کے بارے میں انھوں نے صدیوں پہلے جان لیا تھا۔ بعد میں وہ حقیقت ثابت ہوئے۔ ادب میں حقیقی انقلاب لانے کے لیے ان کی خدمات کلیدی اہمیت کی حامل ہیں۔

دوسری جانب بیکن نے ایک معمولی حیثیت کی حامل مضمون نویسی کو وہ حیثیت بخشی جس کا وہ حق رکھتی تھی۔ ہر دو ادیب متنوع حوالوں سے تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ دونوں کے مضامین کے اسلوبیاتی موضوعاتی، فنی وفکری تجزیے پر حامل مقالہ تحریر کرنا میرے لیے قابل فخر بات ہے۔ میں اپنے تمام اساتذہ کرام بالخصوص نگران مقالہ ڈاکٹر روبینہ شہناز صدر شعبہ اردو کی خاص طور پر شکر گزار ہوں جن کی رہنمائی میرے لیے اس مقالے کی تحقیق میں مشعل راہ ثابت ہوئی۔

میں اپنے نگران دیگر جناب عاصم صاحب کی بھی سپاس گزار ہوں جن کی رہنمائی ہر دم میرے ساتھ رہی۔ علاوہ ازیں میں ڈاکٹر فوزیہ اسلم کی بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے ہر دم رہنمائی اور حوصلہ افزائی کی۔

میں اپنی والدہ اور بہن بھائیوں ودیگر اہل خانہ کی بھی شکر گزار ہوں جن کی دعائیں اور ہمدردیاں اس مشکل مرحلے کے طے کرنے میں ہم رکاب رہیں۔ اللہ ان سب کو جزائے خیر سے نوازے۔

سمیرا ایوب

باب اول:

اصولی مباحث

الف) موضوع کا تعارف:

سماجی اور معاشرتی تبدیلیاں ہمیشہ اشخاص کے رویوں اور تحریکات کے مرہون منت پیش آتی ہیں۔ اس میں ارتقاء کے دو طرفہ اثرات ہوتے ہیں، یعنی فرد کا معاشرے پر اور معاشرے کا فرد پر اثر۔ تقابل کی روایت کو دیکھا جائے تو دنیا کے ہر معاشرے میں تاریخی صورتحال اور اس کا رجحان وارتقاء مختلف ہی رہا ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ لگے بندھے قوانین وضابطے اور رسوم وعقائد صدیوں سے ایک ہی ڈگر پر چلے آرہے ہیں۔ جس کی پابندی کو فرض سمجھ کر کیا جاتا انقلاب کسی خارجی اثر یا بیرونی طاقت کے دباؤ سے نہیں بلکہ تقدیر الٰہی کے زبردست قانون بقاء واصلاح اور انقلاب کے غیر محسوس اور غیر فانی عوامل کے نتیجے سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے اصلی اسباب کو دریافت کرنا مشکل عمل تھا۔ جبکہ فہم وادراک کی طاقت مکمل طور پر نیست ونابود ہو چکی تھی، اور طاقتور کے پاس موجودہ وسائل فرسودہ مشرقی دماغوں سے بہت بلند تھے زیرِ نظر مقالے میں مشرقی اور مغربی نثر نگاری کے درمیان مماثلت وہم آہنگی اور مخالف پہلوؤں کو معاصر ادبی تناظر میں پرکھا جائے گا۔ نیز اردو ادب انگریزی ادب کے دونوں معروف نثر نگاروں سر سید احمد خان اور فرانسز بیکن کے منتخب مضامین کو بروئے کار لاتے ہوئے ان کا گہرا مطالعہ تفہیم وتجزیہ اور اشتراکات واختلافات بیان کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ خاص طور پر مضمون نگاری کی دنیا میں دونوں مصنفین کے مقام ومرتبے کا موازنہ اور تعین کیا جائے گا۔

بیان مسئلہ:

عام طور پر مضمون یا انشائیہ کو خشک اور اکتاہٹ والا موضوع قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ مضمون حقیقت نگاری کا عکس ہوتا ہے۔ مضمون نگار کسی بھی شے کو جو اسے متاثر کرے اسے قلم بند کر سکتا ہے۔ مجوزہ مقالے میں بنیادی بیان مسئلہ یہ ہے کہ اس تحقیق میں معاشی، اصلاحی، اخلاقی،

مذہبی، معاشرتی نیز ہر طرح کے پہلوؤں پر روشنی ڈالی جائے گی اور زمانی اور مکانی لحاظ سے دونوں مضمون نگاروں میں بہت مماثلت ہے تو دونوں کے موضوعات، خیالات وافکار باہم مشترک اور مختلف کیے ہوئے ہیں۔

تحقیق کی اہمیت:

مجوزہ مقالے میں چونکہ سرسید اور بیکن کے مضامین کا تقابلی جائزہ مقصود ہے اس لیے دونوں مضمون نگاروں کے معاشی اور معاشرتی، سیاسی وثقافتی حالات اور زمانی اعتبار سے ادبی رویوں کو ایک جگہ علمی نظر سے دیکھنے کی نئی راہ ہموار ہو گی۔ بیکن کے مضامین میں فکری وفنی مباحث سے انگریزی ادب کے مفاہیم کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ بیکن کے مضامین کے ذریعے مغربی ادب کی تصویر کشی کی جائے گی، اور ادبی شعور سے آگہی حاصل ہو گی۔ سرسید کے مضامین کے ذریعے ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد مشرقی استحصال زدہ معاشرے کی عکاسی اور تہذیبی چال چلن کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق:

مجوزہ موضوع پر اس سے قبل کافی کام ہو چکا ہے اور انفرادی سطح پر دونوں مصنفین پر مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ تاہم یہ تقابلی جائزہ اردو ادب میں اس سے قبل نہیں ہوا۔ میری تحقیق کا مقصد دونوں مصنفین کے کام کی انفرادیت ظاہر کرنا ہے اور علم بیان وبدیع کی مدد سے دونوں کے مضامین کا تقابل کرنا ہے۔

ماقبل کیے گئے تحقیقی کام کے عنوانات درج ذیل ہیں:

- اردو کی علمی ترقی میں سرسید کے رفقائے کار کا حصہ۔
- سرسید اور اقبال کے عمرانی تصور کا تقابلی مطالعہ۔
- سرسید کے علمی کاموں کا تنقیدی مطالعہ، سرسید کا نظریہ تعلیم وتربیت، سرسید کا تصور تعلیم۔
- عہد سرسید میں مضمون نگاری کا ارتقاء، اردو میں مضمون نگاری کا ارتقاء۔

- سرسید کے ادبی اسلوب کا جائزہ۔
- سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت۔
- سرسید کے سیاسی افکار۔

A comparative study of Francis Bacon and Bertrand Russell's prose style Democracy and frontier a comparative study of Bacon's Rebellion (1676) and the Graff-Reinet Rebelion (1796-1795). A comparison of Bacon and Swift's proses style.

تحقیقی طریقہ کار:

مجوزہ موضوع پر تجزیاتی طریقہ کار کو بہترین اور موثر بنانے کے لیے تاریخی دستاویزی طریقہ کار کو اپنایا جائے گا۔ اس طریقے کے تحت بنیادی اور ثانوی ماخذات سے مواد کی جمع آوری کی جائے گی۔ موضوع سے متعلق معاصر تنقیدی کتب اور مضامین سے مدد لی جائے گی۔ اس کے علاوہ مختلف لائبریریوں، معاصرین ادب اور ادبی ناقدین سے ملاقات بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔ نیز سرسید اور بیکن کے مضامین کو بنیادی ماخذ کے طور پر پیش کیا جائے گا۔

نظری دائرہ کار:

اردو مضمون نویسی اور انگریزی مضمون نویسی کی مختلف جہتوں کا بغور جائزہ لیا جائے گا اور اپنے تحقیقی مقالے کو بروئے کار لاتے ہوئے فکری اور فنی، مشرقی اور مغربی سطح پر مضمون نویسی اور تقابل کی مختلف پرتوں کو وا کیا جائے گا۔

پس منظری مطالعہ:

کسی بھی تنقیدی و تخلیقی کام کے لیے پس منظری مطالعہ ہونا بے حد ضروری ہے۔ مجوزہ تحقیقی موضوع کے لیے تمام مضامین و کتب اور رسائل و جرائد کا بغور مطالعہ کیا جائے گا جن سے مواد کی دستیاب ممکن ہونے کا یقین ہو جائے گا، سے استفادہ کیا جائے گا اور موضوع پر دسترس رکھنے والی شخصیات سے بھی رابطہ کیا جائے گا۔

تحدید:

مجوزہ تحقیقی مقالے میں دونوں مضمون نگاروں کے ۱۰،۱۰ مضامین جو کے موضوعاتی سطح پر مماثلت رکھتے ہیں زیر بحث لایا جائے گا اور مشرقی و مغربی ادب کے حوالے سے دیکھا جائے گا اور دونوں کا فکری و فنی تقابلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔ تاکہ مخصوص اور محدود کام کو اچھے طریقے سے انجام دیا جاسکے۔

مقاصد تحقیق:

مجوزہ موضوع کے مقاصد تحقیق درج ذیل ہیں:

۱۔ مضمون نگاری کے بنیادی اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے سر سید اور بیکن کے مضامین کا فکری تقابل کرنا۔

۲۔ دونوں مصنفین کے مضامین کا فنی تقابل کرنا۔

تحقیقی سوالات:

۱۔ سر سید اور بیکن کے مضامین کے تجزیاتی مطالعے میں کیا کیا اختلافات اور اشتراکات ہیں؟

۲۔ قدر آور مضمون نگاروں کی حیثیت سے سر سید اور بیکن میں فنی و اسلوبیاتی لحاظ سے کون کون سے اشتراکات اور افتراکات ہیں؟

ب) نثر:

انسان علم کے کے حصول کے لیے اپنی پانچ حسوں کو استعمال کرتا ہے۔ پانچ میں سے دو حسیں براہ راست حصول اور اظہار علم کی غماز ہوتی ہیں۔ یعنی قوت سماعت اور گویائی دونوں جس علم اور تجربے کو براہ راست دکھانے میں مدد دیتی ہیں۔ اہل علم کہتے ہیں کہ چار حسیں ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں، یعنی سماعت انسان کو بولنے میں مدد دیتی ہیں اور مطالعہ انسان کو لکھنے اور تخلیق کرنے میں مدد دیتا ہے۔ روزِ اول سے ہی انسان اپنے علم اور تجربے دوسروں تک پہنچانے کی تگ ودود میں منہمک رہا ہے۔ یہ تجربے اور علم ابتدا میں زبانی کلامی ہی نئی نسل کو منتقل کیے جاتے تھے۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسانی سمجھ بوجھ میں اضافہ ہوتا گیا اور تجربات کو بیان کرنے کے نت نئے وسیلے تلاش کر لیے گئے۔ ادب انسانی سماج سے متعلق ہے۔ انسان فطرتاً روایت پسند ہے اور نئی چیزوں کو آسانی سے قبول نہیں کرتا۔ اس لیے تجربات کے باوجود انہیں محفوظ کرنے کی طرف رجحان بہت کم رہا ہے اور انسان کی داستانوں اور تمثیلی کہانیوں سے دلی وجذباتی وابستگی کی شاید یہ بنیادی وجہ ہے۔ اپنے علم کے اظہار کے لیے انسان نے ابتدا ہی سے دو موثر طریقے وضع کر لیے۔ جن میں سے ایک نظم اور دوسرا نثر ہے۔ مواصلاتی ترقی کے امروزہ دور سے قبل طویل وقت کے لیے اپنے گھر بار کو چھوڑ کر دور دراز علاقوں میں بسنا انسان کا جذبہ رہا ہے۔ انسان اپنے علاقے کے لئے ہمیشہ سے دلی وجذباتی وابستگی رکھتا ہے اور اسی وجہ سے جب لوگ نئے سفر پر نکلتے تو گیت اور شاعری کے دوسرے وسائل کے ذریعے اپنے جذبات دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چونکہ کسی بات کو نظم کرنا اس میں استعاروں کی مدد سے بات کرنا ہر انسان کے لیے مشکل کام ہے اس لیے نثر اور بات چیت کا عمومی انداز ہی وہ ذریعہ رہا جس کی مدد سے لگی لپٹی رکھے بغیر اور کسی ضابطے کو اختیار کرنے کی بجائے سیدھی سیدھی بات کہہ دی جاتی۔ نثر ہمیں یہ مواقع فراہم کرتی ہے کہ ہم حصول کی بجائے جس طرح چاہیں اپنے خیالات کو بیان کر سکتے ہیں۔ نثر کی مختلف تعریفیں مختلف لغات میں موجود ہیں مگر اس سے قطع نظر سادہ لفظوں میں نثر تحریر کے اس انداز کو سمجھا جاتا ہے۔ جس میں شاعری کی مانند کوئی خاص ضابطہ نہیں اپنایا جاتا بلکہ عمومی انداز میں اپنے خیالات قلم بند کیے جاتے ہیں۔

ج) مضمون کیا ہے؟

مضمون یونانی زبان کا لفظ (آرتھرن) سے ماخوز جس کے معنی بنیادی طور پر جوڑ کے ہوتے ہیں اور اپنی اصل شکل میں آج بھی یہ لفظ مستعمل ہے جس طرح طب میں (آرتھرائٹس) کا لفظ یعنی التہاب مفصل یا جوڑوں کی سوزش پھر اس جوڑے کے مفہوم سے جڑنے والے اجزا کی مدد سے بیاں ہوا ہے۔ اپنے خیالات و جذبات کو تحریری شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کرنے کو مضمون کہا جاسکتا ہے بنیادی طور پر ایک یا بہت سے مسائل مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے لیے لکھے جاتے ہیں لیکن مضمون میں ایک خاص عنوان کے تحت لکھا جاتا ہے اس صنف نثر میں دن بدن ترقی ہو رہی ہے جس کے ذریعے کسی بھی عنوان کے تحت لوگ اپنی رائے اور حقائق عوام کے سامنے پیش کر رہے ہیں مضمون کی تعریف مختلف لغات میں مختلف ہے جیسا کہ:

فرہنگ آصفیہ میں سر سید احمد دہلوی لکھتے ہیں کہ:

ع۔اسم۔مذکر

ا۔لغوی معنی ہیں ضمن میں لیا ہوا در میان میں ڈالی ہوئی چیز

۲۔معنی۔مطلب۔بیان۔عبارت۔تقریر

۳۔آرٹیکل۔جواب مضمون۔انشا۔ایڈیٹوریل

۴۔بات۔سخن۔بچن۔قول۔[1]

علمی اردو لغت کے مطابق:۔

مضمون:۔(ع۔امذ)

ا۔ ضمن میں لیا ہوا۔در میان میں ڈالی ہوئی چیز

۲۔ مطلب معنی۔بیان

۳۔ جواب مضمون۔انشاء۔اداریہ

۴۔ بات۔ سخن۔ وہ عبارت یا تحریر جو کسی خاص بحث پر لکھی جائے اسی طرح انگریزی میں مختلف لغات سے مدد لی گئی ہے۔

جیسے (شیکسپیئر) رقمطراز ہے۔[۲]

Essay

(Part pass of ضمن) S.M.Contents (of a letter & C)

Import, Sense, Signification, Meaning, Tenure.[۳]

قومی انگریزی اردو لغت کے مطابق:

مضمون:۔ کاوش، سعی؛ کوشش؛ جہد، جواب مضمون، تگ و تاز، تگ و دو، جاں فشانی، محنت، کوئی کام انجام دینے کے لیے کی گئی کوشش۔ مختصر ادب پارہ جس کا مقصد کس خاص نکتے کا اشباب یا موضوع کی توضیع و تعبیر ہو۔ آزمانا یا تجربہ کرنا۔ شان الحق حقی فرہنگ تلفظ میں کہتے ہیں:

مضمون:۔ امذ۔ مفہوم، معنی، مطلب، مندرجات تحریر انشا کسی موضوع پر لکھی ہوئی عبارت، تصنیف ، آرٹیکل، انشائیہ [ع، شامل کیا ہوا۔ ضمانت ہوا]۔[۴]

ایک اور جگہ قاموس مترادف میں وارث سرہندی لکھتے ہیں کہ۔

مضمون:۔

۱۔ شامل۔ متعلق۔ وابستہ

۲۔ تحریر۔ انشا۔ نوشت۔ مقالہ۔ آرٹیکل

۳۔ موضوع۔ مفہوم۔ معنی۔ مطلب۔[۵]

مضمون انگریزی ادب کی ایسی صنف ہے جس میں خیالات اور کسی موضوع سے متعلق اپنا نقطہ نظر واضح انداز میں پیش کیا جائے۔ انگریزی ادب میں مضامین سولھویں صدی سے لکھے جا رہے ہیں مگر مضمون کو واضح شکل دینے میں سر رچرڈ سٹیل، ایڈیسن اور فرانسز بیکن کی خدمات کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مذکورہ مضمون نگاروں نے اس صنف ادب کو معمولی اور غیر اہم حیثیت سے نکال کر قابل قدر بنا دیا۔ جب

سترھویں صدی میں انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے ادب میں مضمون نگاری کی صنف مقبول ہو رہی تھی اسی دوران مسلمانوں کے زوال کے بعد یورپی معاشرہ صنعتی ترقی اور سائنس میں تیزی سے ترقی کرتا رہا ہے لہٰذا اس دوران فلسفہ، تعقل پسندی اور سائنس نے موجودہ یورپی معاشرے کی بنیاد رکھنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ سائنس اور فلسفہ کی بنیاد پر استوار ہونے والے معاشروں میں ہر چیز کے لیے دلائل پر مبنی موقف کو سامنے لانا ضروری تھا لہٰذا ان مغربی مصنفین کو مضمون نگاری میں اظہار رائے کی وہ گنجائش نظر آئی جس کی مدد سے وہ اپنے لوگوں کو اپنے موقف سے آگاہ کرنے میں زیادہ سہولت محسوس کرتے۔

صنعتی ترقی کے لیے صرف سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی یافتہ ہونا ضروری نہ تھا بلکہ عسکری لحاظ سے ایسی مضبوط صلاحیت بھی ضروری تھی جس کی مدد سے وہ عرصہ دراز تک مقبوضہ ممالک پر اپنا قبضہ مستحکم کر لیا تو مضمون نگاری کی رویت بھی انگریزی کے توسط سے اردو میں متعارف ہوئی۔ مضمون نگاری کی روایت کو پروان چڑھانے میں سر سید احمد خان کا کردار سب سے اہم ہے جنہوں نے اپنے سیاسی اور معاشرتی خیالات کے لیے اس مصنف کو رواج دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

سر سید احمد خان اردو ادب کی وہ شخصیت ہیں جنہوں نے جذبات اور معاشرے کے ڈر کی بجائے سیدھے سیدھے اپنے خیالات کو قلمبند کرنے اور اپنا نقطہ نظر دوسروں تک پہنچانے میں مضمون نگاری کا سہارا لیا۔ لہٰذا مضمون اور انشائیہ میں ان کا ذکر کیے بغیر حقائق کی تکمیل ممکن نہیں ہوتی۔

ان کے بعد ادب اور صحافت کی بہت سی مقتدر شخصیات میں مضمون نگاری کے فن کو رواج کمال تک پہنچانے میں اپنا اپنا کردار ادا کیا۔ یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مضامین میں ملائمت، سلاست اور جمال پرستی جیسی خصوصیات مختلف اوقات میں متعارف ہوئی۔

ہم مضمون نگاری کی تاریخ میں اس صنف میں آنے والی تبدیلیوں کو چند نکات میں بیان کر سکتے ہیں۔

ا۔ سر سید کی مضمون نگاری خالصتاً مقصدی اور اپنے افکار کے بیان سے معمور تھی۔ لہٰذا یہ روایت بعد میں مذہب، مسلک اور سیاسی نقطہ ہائے نظر کو بیان کرنے کے لیے مختلف ادیبوں نے استعمال کیا۔

۲۔ شبلی نعمانی اور محمد حسین آزاد نے نثر کی خوبصورتی اور جمالیات کے اظہار کے لیے جو زبان استعمال کی وہ بعد میں ان ادیبوں کے کام آئی جنہوں نے ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے غیر اہم اور ادبی موضوعات پر زبان کے جوہر دکھانے کی کوشش کی۔

۳۔ ایک دفعہ جب مضمون نگاری کی روایت میں اردو ادب نے جڑ پکڑ لی اور ان کی تقلید ہمارے مضمون نویسوں کی روایتوں کو اپنانا اوران کی تقلید ہمارے مضمون نگاروں کے ہاں زیادہ اہمیت کی حامل نہ رہی جبکہ ہر مضمون نگار اپنے مطالعے اور نظریے کے مطابق اپنا راستہ خود تلاش کیا۔

اصولی مباحث

مضمون نگاری:۔

ہماری زبان میں تین الفاظ بہت اہم ہیں۔ جن کو عام طور پر لوگ ایک ہی طرح کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔

ا۔ مضمون ۲۔ مقالہ ۳۔ انشاء / انشائیہ

اصل میں مضمون ان سب میں سے بہترین اور مناسب تشریح ہے جس کو ہم نئے طرز میں مضمون نگاری یا ایسّے کہتے ہیں، جدید طرز مضمون میں اس کا ترجمہ ایسّے ہی کیا جاتا ہے۔ لیکن اب اس میں ممکن حد تک تبدیلی نے اس کو بھی تبدیل کر دیا ہے اور مضمون (Essay) کہ انشائیہ بھی کہا جاتا ہے۔ ویسے مضمون کو جتنا زیادہ روانی اور بر محل استعمال کیا گیا ہے اس حوالے سے اس کی دو اقسام ہونی چاہیے۔ ایک بے قاعدہ مضمون اور دوسرا با قاعدہ مضمون۔

بے قاعدہ میں مضمون کی خوبیاں ہیں ہی نہیں یا دوسری قسم سے کم ہیں۔ با قاعدہ ایسّے وہ صنف ہے جس میں چار چیزیں بہت اہم خیال کی جاتی ہیں۔

ا۔ مختصر تحریر

۲۔ نامکمل

۳۔ گھریلو یا سادہ انداز بیاں جس میں تکلیف کا عمل دخل کم ہی ہے۔

۴۔ سنجیدگی اور متانت۔

ایسّے میں شگفتہ پن بہت کم ملتا ہے، لیکن اس میں یہ صفت اور خوبی ضرور موجود ہونی چاہیے کہ وہ خود اپنے آپ کو بنتا اور بناتا ہو۔ ایسّے میں ہر مضمون یا عنوان مکمل ادا ہو سکتا ہے۔ کسی معروف شخص نے بہت خوب کہا ہے کہ

ذروں سے لے کر ستاروں کی دنیا تک کے مضمون اس میں آسکتے ہیں۔

غرض کے بڑی سے بڑی بات اور چھوٹی سے چھوٹی بات کو مضمون کے زمرے میں لیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ بعض مضامین بہت ہی بے ڈھنگے اور بے قاعدہ ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم ان کو مضمون کہنے پر مجبور ہیں۔ لیکن ایک بات سب سے اہم ہے کہ ہر مضمون میں ہر خوبی مکمل طور پر موجود نہیں ہو گی۔

سماجی اور معاشرتی تبدیلیاں ہمیشہ اشخاص کے رویوں اور تحریکات کے مرہون منت منظر عام پر آتی ہیں۔ جس میں آغا زوار تقاء ہر طرف کے اثرات کو قبول کرتا ہے۔ خاص کر فرد کا معاشرے پر اثر اور معاشرے کا فرد پر اثر عام طور پر مضمون کو خشک، اکتاہٹ اور بوریت والی صنف کہا جاتا ہے۔ لیکن اصل حقیقت اس سے بالکل برعکس ہے کیونکہ بنیادی طور پر مضمون حقیقت نگاری کا عکس و آئینہ دار ہوتا ہے۔ جس میں مضمون نگار معاشرے میں ہونے والی کوئی بھی حقیقت جو اسے متاثر کرے اسے دنیا کے سامنے لاتا ہے۔ ارد گرد کے لفظ مضمون میں کہانی کی طرح ہی ہوتے ہیں۔ ان کے اندر بہت سی باتیں سما جاتی ہیں۔ جن میں عزیز و اقارب کے خطوط، روداد، ثقافتی و ادبی محافل کی منظر کشی، کسی پر کشش شخصیت سے ملاقات، کسی بھی متانت خیز موضوع پر تخیل ظاہر کرنا، کسی اہم شخصیت کی زندگی کی داستان کے کچھ روشن پہلو، کسی اداریے کی طرح یا کسی بھی عنوان پر اپنی رائے کا اظہار کرنا حتیٰ کہ اس قسم کی وہ تمام باتیں جو المختصر سی بھی نثری پیرائے میں بیان کی گئی ہوں اسے آسان الفاظ میں مضمون کے نام سے روشناس کیا گیا ہے۔

سب سے پہلے ایک فرانسیسی مفکر مونٹین نے اپنے خیالات و جذبات قلمبند کیے جسے مضمون کا نام دیا گیا۔ لیکن عصر حاضر میں مضمون نے باقاعدہ ایک شکل اختیار کر رکھی ہے جو کہ اپنے افکار و خیالات مین مکمل

نظر آتا ہے۔ ابتداء مضمون صرف ایک ہی عنوان کے تحت لکھے جاتے تھے۔ لیکن بعد میں مضمون نگار نے اسے باقاعدہ طور پر لکھنے کی سعی اس لیے بھی کی کہ وہ اپنے جذبات اپنی سوچ اور اپنی ذہنی استعداد کو دوسروں تک اور خاص کر ادب میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ دوسرے رومانوی ادب کی بجائے لوگ متانت اور سنجیدہ گفتگو کو بھی زندگی کے اہم موضوع تصور کریں اور اس پر طبع آزمائی کریں۔ جبکہ اے سی بینسن مضمون نگاری کے بارے میں لکھتے ہیں کہ

"The art of the essay"

An essay is thing which someone does himself, and the point of the essay is not the subject, for any subject will suffice, but the charm of personality.[۱]

مضمون نگاری میں جدت آہستہ آہستہ ہی ہوئی۔ اس کی کوئی بھی مکمل تاریخ اور تعریف نہیں جس سے اس کے مفاہم کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔ اس کے لیے ہمیں اپنے قدیم نثر نگاروں کی نثر سے ہی رجوع کرنا ہوتا ہے۔ ویسے تو اردو میں مضمون نگاری کا ارتقاء تو علمی و سائنسی بنیادوں پر ہوا لیکن چونکہ وقت ہمیشہ ایک سا نہیں رہتا اس لیے مضمون نگاری کے موضوعات میں بھی رفتہ رفتہ وسعت اور تبدیلی آتی رہی۔ آج معاشرتی و سیاسی، تاریخی و لسانی، سائنسی، ادبی، علمی، اصلاحی، توضیحی، مزاحیہ اور تحقیقی مضامین شامل ہیں۔ لیکن ان سب کے باوجود ادبی مضمون نگاری ہمارا بنیادی۔

اس ضمن میں مضمون کی تعریف The Encyclopedia of America نے یوں کی ہے۔

The essay as a literary genre is very broad, Lovering many sub form a wide range of subject, and a variety of styles, The essay and artistically wrought and imaginatively developed work of nonfiction, may reveal an author's personality , authors, express his speculations on life or events. Or make a formal statement about his attitude to words a precise, objective subject.[۲]

ایک ایسا سوال جو سب کے ذہنوں میں گونجتا ہے وہ یہ کہ مضمون کے لغوی معنی تو بہت سی مستند لغات یعنی فرہنگ آصفیہ وغیرہ کے مطابق،، ضمن میں لیا ہوا،، ہیں۔ اوراس کے برعکس ایسّے کے لغوی معنی کوشش کے ہیں پھر ایسّے کے لیے مضمون کا لفظ کیوں مروج ہوا، مضمون کی کوئی مکمل اور جامع تعریف نہیں کی جاسکتی کیونکہ کسی بھی عنوان کو مخصوص طرز دے کر لکھنا ہی مضمون ہے لیکن ادب کے ماہرین اس بات سے اتفاق کرتے ہیں کہ مضمون کی حد بندی کی جاسکتی ہے جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا اینکارٹا نے بیان کیا ہے۔

> Essay–Literary composition devoted to the presentation of the writers own ideas particular aspects of the subject.[۸]

گویا مضمون اپنے ذاتی خیالات و جذبات کو صفحہ قرطاس پر لانے کی سب سے بہترین صنف اور اس میں خاصا تنوع اور وسعت ملتی ہے جو کہ مضمون نویس گاہے بگاہے استعمال بھی کرتا ہے۔

د) ادب کیا ہے؟

ادب کیا ہے؟ دنیا میں اس کا اظہار کیسے ہوا؟ اور اس دنیا کے باسیوں سے اس کا کیا تعلق ہے اور کیا ہو سکتا ہے اور کیا ہونا چاہیے؟ ایسے سوالات اور اس نوع کے کچھ اور بھی سوالات آج سے بہت ہی زیادہ عرصہ پہلے بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں گردش کرتے رہے اور جیسا جیسا ممکن ہوتا رہا ہمارے ادیب اور مفکر ان سوالات کے جوابات دیتے رہے۔ لیکن ہر دور کے لوگوں کو ان مخصوص جوابات سے تسلی نہیں ہوئی اس لیے ان پر اظہار رائے بدل بدل کر استفسار کیا جاتا ہے، گو کہ پہلے لوگوں کا مقصد صرف ان سوالات کے جوابات پوچھنا تھا لیکن اب ان جوابات سے۔۔۔ کتنی تسلی حاصل کرتا ہے۔ یہ بات زیادہ قابل غور سمجھی جاتی ہے، اور آج کے لوگ ویسا جواب مانگتے ہیں جو ایک دم سے ان کی حیرتوں کو توڑے اور بہت دلکش ہو۔ لیکن اصولی طور پر ہمارے جوابات کو حسن کی بنا پر نہیں بلکہ عقلی استدلال پر پرکھا جانا چاہیے۔ ہماری ساری بات کا حاصل یہ ہونا چاہیے یعنی کہ،، ادب کا انسانی زندگی سے کیا تعلق ہے''؟

ہر ادبی تخلیق میں ادبی رجحان کی خاصیت کا ہونا بہت ضروری خیال کیا جاتا ہے، جس کے لیے جرمن زبان کا ایک لفظ۔۔۔ کو مستعمل کیا گیا ہے۔ جس کے بنیادی معنی ہیں ''روح عصر''۔

اب اس بات کو سب سے اہم خیال کیا جاتا ہے کہ خوبصورتی، بھلائی اور حقیقت نگاری ان تینوں کے مجموعے کا نام ادب ہو سکتا ہے۔ جس میں حسن تخیل اور حسن عمل کو ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم قرار دیا گیا ہے۔ لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ کسی بھی ادبی تخلیق کا مقصد ایک ایسا خیال اور آرزو جو دوسروں تک کسی بھی صورت پہنچانا لازم ہے کا ہونا اصلی اور مضمر عمل ہونا چاہیے۔

جیسے ایک وقت میں بہت بڑے ادباء اور شعراء نے اپنی تخلیقات کے ذریعے دنیا تک اپنی آواز پہنچائی اور دنیا کے لوگوں میں مختلف طرز سے جینے اور سوچنے کی امنگ پیدا کی۔ آج اگر ان ادیبوں اور شاعروں کا موازنہ کیا جائے تو ہمارے پاس بامقصد اور با معنی تخلیقات کی بہت حد تک کمی پائی جاتی ہے۔ کیوں کسی نے آج،، شاہنامہ،، نہیں لکھی؟ کیوں،، ڈوائن کامیڈی،، دوبارہ تخلیق نہ ہو سکی۔ سو ہم ہر دور کے ادب کو اس کے بنیادی حقائق کو سامنے رکھ کر اندازہ لگائیں گے کہ اصل میں ادب ہے کیا؟ اور اس کو کتنے درجات میں منقسم کر دیا گیا ہے۔ اگر تاریخی مطالعہ کیا جائے تو دنیا کا ادب مینارہ نور ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ ادب انسان کے تخیل و افکار کا ترجمان ہوتا ہے۔ جیسا زمانہ ہوتا ہے ویسی ہی سوچ اس زمانے کے لوگ اختیار کریں گے۔ ہماری قومیں اپنے تخیل و افکار میں اپنے کام کارناموں میں اپنے رہن سہن میں اس حاکم کے زیر ماتحت چلتی ہے جو اس زمانے کا چڑھتا سورج ہوتا ہے۔ جس کی روشنی اس زمانے کے لوگوں تک پہنچ رہی ہوتی ہے، کیونکہ اب ادب کا تعلق متوسط گھرانوں کی متوسط زندگی سے ہے اور اسی کا عکس پیش کرتا ہے۔ اب حالی، اقبال، ملٹن، شیکسپیئر کسی تہذیب کے خیالاتی کردار ہیں۔

ادب کا تعلق برائے راست انسانی زندگی سے ہے کیونکہ بنیادی طور پر ہر شخص کے دل میں ایک جذبہ ہوتا ہے امنگ ہوتی ہے کہ معاشرے میں اسے جانا اور مانا جائے۔ وہ کچھ ایسا کام کرے جو اسے دوسروں سے ممیز و ممتاز کرے اس کے دل میں یہ خواہش ابھرتی ہے کہ اس کی باتوں کو اس کے خیالات کو وقعت دی جائے۔ ابتدا میں جب انسان کو عقل و خرد عطا کی گئی ہے تو اس نے مختلف اندازو اطوار سے اپنے جذبات

دوسروں تک پہنچانے چاہیے جس میں سب سے پہلے استادوں سے بات کی گئی پھر آوازوں سے اور پھر ان سب چیزوں کو عقل و فہم سے استعمال کیا جانے لگا۔

ادب فن کی سب سے بہترین اور لطیف صورت ہے۔ جو کہ بہت سی کانٹ چھانٹ کے بعد وجود میں آیا ہے۔ زندگی میں آنے والے غم و خوشی کی کیفیات اور زندگی کے نشیب و فراز کو مخصوص الفاظ کے ساتھ زیب قرطاس کرنے کو ہی ادب کا نام دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ کہتے ہیں کہ:

> ادب فن لطیف ہے جس کا موضوع زندگی ہے۔ اس کا مقصد اظہار، ترجمانی اور تنقید ہے۔ اس کا سرچشمہ تحریک احساس ہے۔ اس کے معاون اظہار تخیل اور قوت مخترعہ ہیں اور اس کے خارجی روپ وہ حسین ہئیت اور وہ خوبصورت پیرایہ ہائے اظہار ہیں جو لفظوں کی مدد سے تحریر کی صورت اختیار کرتے ہیں۔[9]

ادب کی تخلیق انسانی زندگی سے ہوتی ہے اس لئے عوام الناس کے انفرادی و اجتماعی خیالات و افکار کا سب سے اہم مجموعہ ہے۔ اس لیے ہر معاشرے میں جنم لینے والا ادب اپنے مخصوص انداز و اطوار کی بنا پر دنیا میں پہچانا جاتا ہے اور پھر وہی اس کی پہچان بن جاتا ہے کیونکہ کسی بھی ملک کے ادب کی پہچان اس کے علاوہ اور کیا ہو گی کہ وہ اپنے ماحول، ثقافت، معاشرے اور عوام کے دلی جذبات کی عکاسی کرتا ہو۔

زندگی کے بدلتے حالات کے ساتھ ساتھ ادب بھی بدلتا رہتا ہے۔ زمانے کی ٹھوکریں کھا کر وہ جو زندگی اختیار کرتا ہے اسے ادب میں سمویا جاتا ہے۔ کیونکہ ادب ہمیشہ معاشرے کے حوادث کو قلمبند کرتا ہے جو کہ بالکل سچا اور حقیقت پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور پھر معاشرہ جس قدر حق سچ کو ماننے والا ہو گا وہاں سے جنم لینے والا ادب بھی اتنا ہی خالص اور اہم ہو گا۔ ڈاکٹر حسرت سگنجوی کے مطابق:

> ادب کا بنیادی عنصر سچائی ہے۔ ادب کیونکہ زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس طرح ادب کے ذریعے ہمارے سامنے زندگی کی تمام حقیقتیں اور سچائیاں ہوتی ہیں۔ سچائی ایک بہتر معاشرے کی بنیاد ہے۔ اس لیے ادب براہ راست ایک بہتر معاشرے کی بنیادوں کو مستحکم کرتا ہے۔[10]

قرون اولیٰ کے زمانے ہی سے یہ بات طے شدہ ہے کہ انسان کے ابتدائی خوبصورت خیالات و افکار اور دلی جذبات کی عکاسی ادب ہی کے ذیر اثر ہے۔ ادب الفاظ کی مدد سے جذبات و خیالات کو پروان چڑھایا ہے۔ جس سے زبان انداز، مزاج اور نئی صورت سامنے آتی ہے۔ کسی بھی زبان سے تعلق رکھنے ولے ادبا اور شعرا کے ذاتی خیالات کا عکس ان کے بہترین معانی و مطالب کی منظر کشی کرتا ہے۔ ادب اس چیز کو بھی کہا جاتا ہے جس سے انسان کے روزمرہ اور انداز و اطوار میں روانی، سلاست پیدا ہو سکے۔

ہ) اردو میں ادبی مضمون نگاری کی روایت:

تحقیقی پس منظر:۔

موجودہ دور میں بہت سی ادبی اصناف انگریزی سے دوسری زبانوں میں متعارف ہونے لگیں۔ مضمون نگاری کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس صنف کا آغاز بھی انگریزی زبان سے اردو میں منتقل ہوا۔ اس سلسلے کی سب سے اہم کڑیMichel de Montaigne کو سمجھا جاتا ہے۔ جس نے سب سے پہلے اپنے احساسات کو منظرِ عام پر لایا ہے۔ اس نے ۱۵۸۸ء میں مضمون نگاری کا آغاز کیا۔ پہلا مجموعہ ۱۵۸۰ء میں اور دوسرا ۱۵۸۸ء میں شائع ہوا۔ یوں اس کے مضامین کی مقبولیت کا آغاز ہو گیا اور اردو ادب نثر کے میدان میں آئندہ آنے والوں کے لیے گہرے نقوش ثبت کر گیا۔

مونٹین کے مضامین عام اور سادہ انداز میں تحریر کردہ ہیں جو کہ اس کے ذاتی تجربات اور احساسات پر مبنی معلوم ہوتے ہیں فرانسز بیکن مونٹین کے بارے میں یوں رائے دیتا ہے:۔

> Grain of salt which will rather give an appetite than offend with satiety.

نمک کی ایسی مقدار جو بھوک بڑھانے میں مددگار ہو بجائے اس کے کہ اپنی افراط کی وجہ سے آزردہ کر دے۔ اس کے بعد مونٹین کی مقبولیت بڑھنے لگی اور اس کے مضامین کے تراجم ہونے لگے سب سے پہلے اطالوی نژاد مترجم جان فلورریو انے کیے۔ اور اس نئے انداز کو انگریزی زبان و ادب میں بہت اعلیٰ مقام حاصل ہو گیا۔ اور اسی طرح اور اسی طرح مونٹین کی صنف ادب مقبول عام ہونے لگی۔ باقاعدہ طور پر

انگریزی زبان میں اس کا آغاز فرانسز بیکن (۱۵۶۱ء سے ۱۶۲۷ء) نے کیا۔ اس کے مضامین کا سب سے پہلا مجموعہ ۱۵۹۷ ء میں شائع ہوا۔ اور بہت زیادہ مقبول ہوا۔ بیکن مضامین نویسی میں مونٹین کے مضامین سے متاثر تھا۔ لیکن اس نے آغاز ہی سے اپنا مختلف انداز اپنا کر ایک الگ انداز تحریر میں اپنا نام پیدا کیا۔ مونٹین کے مضامین آزاد خیالی اور دلچسپ پیرائے میں لکھے ہوئے ہیں۔ لیکن بیکن نے انگریزی ادب میں مضمون نگاری کر کے ایک نئی راہ متعین کی جو کہ اسے دوسروں سے الگ اور نمایاں کر کے پیش کرتی تھی۔ سب سے اہم بات جو ہمارے لیے بحث کا موضوع ہے وہ یہ کہ دوسرے نثر نگاروں اور بیکن کی نثر میں کیا فرق ہے ؟ کیونکہ اس سے پہلے کسی بھی نثر نگار نے مضمون کو اتنا منظم اور مربوط طریقے سے نہیں کیا جتنا بیکن نے پیش کیا ہے۔ بیکن نے زندگی کے ہر پہلو پر قلم اٹھایا ہے۔ عام موضوعات پر اختصار سے لکھنا بیکن کی سب سے بڑی خوبی اور خصوصیت ہے، مثلاً دوستی، سمجھ اور عزت وغیرہ۔

بیکن کے بعد مضمون نگاری کو ادب کی دنیا میں ایک نمایاں نام کے طور پر جانا مانا جانے لگا کیونکہ عام موضوعات کو اس طرح سے پہلے کبھی کسی نے قلم بند نہیں کیا تھا۔ زندگی کی حقیقتوں کو وہ بہت خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔ بہت بڑی بات کو مختصر الفاظ کے ساتھ کوزے کو دریا میں بند کرتے ہیں۔ بیکن نے بنیادی طور پر مونٹین کی روایت کو آگے بڑھایا ہے، بیکن سے پہلے اور مونٹین کے بعد ابراھیم کاؤلی نے بھی مضامین نگاری میں طبع آزمائی کی۔ مغربی ممالک میں جب نشر واشاعت کا آغاز ہوا تو اس صنف کو خاصی مقبولیت ملی۔ کیونکہ مضمون کم وقت میں پڑھی جانے والی تحریر ہوتا ہے۔ اور اس کے مقاصد بہت ہی بڑے اور واضح ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس میں ذہنی قوت کم استعمال ہوتی ہے، سائنس میں دن بدن ترقی نے نشر واشاعت کے میدان میں بہت وسعت پیدا کی ہے۔ اور ہر تحریر چاہے اچھی ہو یا بری عوام وخواص تک پہنچنے لگی۔ یوں ادب طبقہ اشرافیہ سے نکل کر عام لوگوں تک بھی پہنچنے لگا۔ اور اب تمام لوگ بھی اس کو پڑھ کر لکھ سکتے تھے۔ اور اپنی اپنی رائے قائم کر سکتے تھے۔

اس عہد کے سب سے نمایاں مضمون نگار سر رچرڈ سٹیل ۱۶۷۲ء سے ۱۷۲۹ء ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے اخبار,, ٹیٹلر،، اور بعد ازاں،، سپیکٹیٹر،، جاری کیا۔ جس کے بعد مضمون کو روز مرہ زندگی کا حصہ سمجھا

گیا۔ انگلستان میں اس سے پہلے عام لوگوں کے جذبات کا عکاس کوئی بھی نہیں تھا۔ اخبارات کی مانگ بڑھ گئی تھی اور اسی عہد میں مضمون کو فروغ ملنا شروع ہوا۔ جریدی مضامین کے ارتقاء میں ڈینئل ڈیفو کا نام سب سے اہم گردانا جاتا ہے۔ بلکہ اس کا آغاز ہی ڈیوٹے کیا۔ اس کے مضمون،، ٹیٹلر،، کا اہم حصہ رہے ہیں۔ سب سے پہلے رچرڈ سٹیل نے،، ٹیٹلر،، اور پھر جوذف ایڈیسن نے سپیکٹیٹر کا آغاز کیا۔ یہ رسائل اور ان میں لکھے جانے والے تمام مضامین پورے یورپ میں ایک وبا کی طرح پھیل گئے۔ اور تقریباً ہر شخص کے زبان زدعام ہو گئے۔

کسی بھی مضمون کی مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ ان کا مختصر انداز ہے جو کہ زندگی کے متنوع موضوعات کو قلم بند کرنا مضامین نویسی سے ہی ممکن ہے، اور صرف یہی ایک وجہ تھی جو سٹیل اور ایڈیسن کو پورے یورپ میں مقبول عام کر گئی۔ ڈاکٹر سلیم اختر کے مطابق:

> اگر یہ کہا جائے کہ انگریزی ایسّے کی عمارت اور جوذف ایڈیسن اور رچرڈ سٹیل نے پختہ بنیادوں پر استوار کیا جو اسے مبالغہ نہ سمجھا جائے۔"

دونوں رسائل میں ایڈیسن کے مضامین مسلسل چھپتے رہے، وہ مضمون نویس تھا مگر ایسا ماہر کہ اپنی نشر کو ہمیشہ تر و تازہ اور مزے دار و دلچسپ رکھتا تھا۔ چونکہ اسے سیاست سے بہت زیادہ لگاؤ تھا اس لیے اس کے مضامین میں بہت وسعت اور گہرائی ملتی ہے۔ وہ بعض جگہوں پر طنز و ظرافت کا سہارا لے کر اپنے معاشرے کی سماجی اور معاشرتی روایات کو اپنے مضامین میں پیش کرتا تھا۔ اور اس مقصد کے لیے اس نے اپنے معاشرے میں جنم لینے والے مسائل و مشکلات کا خاص طور پر جائزہ لیا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے مطالب و معانی نکالتا تھا۔ وہ جس عنوان کو زیر قلم کرتا تھا اسے حقیقت سے اتنا قریب کر کے دیکھاتا کہ پڑھنے والا حقیقت مانے بغیر نہ رہ سکتا، اسی وجہ سے سر سید احمد خان سٹیل اور ایڈیسن کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ یوں کرتے ہیں:

> سٹیل اور ایڈیسن کی ایسی عمدہ تحریریں ہوتی تھیں کہ ان کا اثر صرف مجلسوں کی تہذیب و زبان اور گفتگو کی شائستگی ہی پر نہیں ہوتا تھا بلکہ اس زمانے کے مصنفوں پر بھی اس کا نہایت عمدہ اثر ہوتا تھا۔"

ان دونوں مضامین نویسوں نے ایسّے کے فروغ کے لیے بے پناہ کام کیا۔ ہر طرح کے موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا مثلاً Ladies Headdress and recollection of childhood وغیرہ۔ انہوں نے مضمون کو ایک دنیادی انگریزی مضمون میں سوچ کی نئی جہتیں روا کیں۔ اگلی نسل میں آنے والے مصنف وادیب اس حقیقت کو ماننے سے انکار نہ کر سکے۔

ایڈیسن نے سٹیل سے تھوڑا سا مختلف کام کیا۔ گو کہ دونوں ہی بہت اعلیٰ پائے کے نثر نگار تھے لیکن ایڈیسن نے اصلاح معاشرہ کے لیے طنز وظرافت کا سہارا لیا اور اسی بنا پر سٹیل کی بہ نسبت ایڈیسن زیادہ معروف ہو گیا سٹیل نے زیادہ مضامین سیاست کے متعلق لکھے۔ جس پر وہ بہت مہارت رکھتا تھا۔ وہ بالکل آزاد خیالی سے ہر موضوع کو قلم بند کرتا اور اپنے فن کو ماہرانہ انداز میں استعمال کرتا۔

دونوں رسائل مضامین کی دنیا میں ایک بہت بڑا نام تھے۔ جنہوں نے معاشرتی مسائل پر گفت وشنید کرنے کی نئی اصلاح وضع کی، جس کے معاشرے میں تاثرات بھی نمایاں رہے، انگریزی مضمون نگاری کی وسعت میں بہت سے ااہم نام سر فہرست ہیں جن میں سوفٹ (۱۷۴۵ء۔۱۶۶۷ء)، گولڈ سمتھ (۱۷۲۸ء۔ ۱۷۷۴ء)، لی ہنٹ (۱۷۸۴ء۔ ۱۸۵۹ء)، چارلس لیمب (۱۷۷۵ء۔ ۱۸۳۴ء) اور ولیم ہیزلٹ (۱۷۷۸ء۔ ۱۸۳۰ء) شامل ہیں۔ اٹھارویں صدی کے اوائل میں یورپ میں سائنس کا آغاز وارتقاء ہوا جس میں ادب نے بھی نمایاں نام پیدا کیا اور وہاں سے نثر کا ارتقاء ہوا۔

سر سید نے سپکٹیٹر اور ٹیٹلر کے مطالعہ کے بعد اپنی ایک میگزین یا رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا اور یہیں سے اردو نثر کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اس رسالے کے حوالے سے ایک مصنف فاریس وطاسی اپنے خیالات وجذبات کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> یہ ایک تصویر اخبار ہے جس میں سائنس، ادب اور سیاست پر تحریریں ہوتی ہیں۔ اس کا مقصد اپنے ہم وطنوں میں مغربی خیالات کی اشاعت ہے۔ ہفتہ میں ایک ہی بار شائع ہوتا ہے۔[۱۳]

انشائیہ اور مضمون کا باہمی اشتراک کیا ہے اور یہ دونوں ایک جیسی معلوم کیوں ہوتی ہیں اس بات کو سمجھنے کے لیے انشائیے کا مختصراً تعارف بھی ضروری ہے اس لیے ڈاکٹر شبیر سیفی کچھ یوں فرماتے ہیں کہ:

> انشائیہ وہ صنف نثر ہے جس میں مصنف اپنے ذاتی تاثرات اور انفرادی تجربات بے تکلفی اور اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہے۔ اس صنف میں لکھنے والے موضوع کے حوالے سے ذہن میں در آنے والی دیگر باتوں کا ذکر بھی کر سکتا ہے۔ تاہم موضوع سے انحراف نہیں۔ نیز انشائیہ نگار موضوع کے چھپے ہوئے گوشوں پر روشنی ڈال کر قاری کو پر تخیر مسرت بہم پہنچاتا ہے۔[۱۴]

ایسی ہی معلومات اگر مضمون کے بارے میں کی جائیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مضمون بھی ایسا ہی صنف سخن ہے جس میں آزادی رائے کا احساس موجود ہوتا ہے۔ جس میں انسان اپنے جذبات و احساسات کو عقلی دلائل کے مطابق پیش کرتا ہے۔ جیسے بیان ہو چکا ہے کہ خاص طوالت بھی ہوتی ہے مضمون میں اور ابتدائیہ ایک مکمل تمہید کے ساتھ ہوتا جس میں زیر بحث موضوع کا تعارف کیا جاتا ہے۔ اس میں خوبیاں اور خامیاں مدلل طریقے سے بیان کی جاتی ہیں جس کے بعد آخر میں ایک نچوڑ نکالا جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ انشائیہ کا کوئی تمہیدی آغاز نہیں ہوتا لیکن بشیر سیفی اس بات کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں:

> مضمون کڑی منصوبہ بندی کے تحت لکھا جاتا ہے اور لکھنے والا موضوع سے ادھر ادھر نہیں ہوتا۔ جبکہ انشائیہ نگار انشائیہ میں فکری آزادہ روی کا مظاہرہ بھی کر سکتا ہے۔ جسے ذہن کی آوارہ خرامی کا نام دیا گیا ہے۔[۱۵]

اردو مضمون نگاری میں سادگی و روانی انگریزی سامراج کے ثمرات کا نتیجہ ہے۔ خاص طور پر دلی کالج نے مضمون نگاری کے میدان اردو نثر کے مصنوعی اور غیر موثر عبارت آرائی اور عبارت کے مقفیٰ و مسجع فقرات کے استعمال کو ترک کر دیا۔ اسی کے ساتھ مضمون نگاری نے خیالی عنوانات کو ختم کر دیا اور اس کی جگہ پر زمانی مسائل و معاملات پر سادہ اور رواں انداز میں مضامین لکھنے کا آغاز وارتقاء ہوا۔

تکنیکی طور پر اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مضمون کے تین اہم اجزاء ہوتے ہیں۔ ابتدائیہ یا آغاز، پھر نفس مضمون اور سب سے آخر میں اختتامیہ آتا ہے۔ آغاز میں موضوع کا تعارف ہوتا ہے۔ کیونکہ

مضمون کا آغاز ہمیشہ دلچسپ انداز میں ہونا چاہیے تا کہ پڑھنے والے فوراً اس کی طرف متوجہ ہوں۔ مضمون ایک با قاعدہ آغاز پیدا کرنے کا سب سے اعلیٰ و بہترین موجب ہے۔ جس کے ساتھ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس میں پڑھنے والے کی دلچسپی قائم دائم رہے۔

دوسرا حصہ نفس مضمون ہے جس میں عنوان کے متعلق ساری معلومات موجود ہوں گی۔ موضوع کی وضاحت کے علاوہ جذبات و احساسات کا جواب دلائل اور منطق کے ساتھ دیا جاتا ہے جن کا خاص الخاص اور براہ راست واسطہ متعلقہ موضوع سے ہوتا ہے۔ اور نفس مضمون کے حامل سب باتوں کو دلائل کے ساتھ بیان کیا ہونا چاہیے۔ مضمون کے اندر موضوع کے متعلق ساری مدلل بحث کو ایک جگہ اکٹھا کرنا ہی اختتامیہ کا سب سے بنیادی اور اہم جزو ہے بلکہ کسی حد تک ہم کہہ سکتے ہیں کہ اختیامبہ کا روح ہوتا ہے۔ مضمون کی طوالت کی بھی ناقدین ادب نے ایک خاص حد مقرر کر رکھی تا کہ یہ عمومی طور پر تین سے پانچ پیرا گراف پر مشتمل ہونا چاہیے۔ جس میں ہر پیرا گراف موضوع سے متعلق ایک خیال ایک بات کو مکمل جامعیت کے ساتھ پیش کرنے کا حامل ہو۔ مضمون میں ایسی تکنیک کا استعمال نہیں کرنا چاہیے جسے عام پڑھنے والے نہ سمجھ سکیں یا ان کی سمجھ سے بالا ہوں۔

ادب کی باقی تمام صنفوں کی طرح مضمون بھی اپنے حسن وجمال کو فنی لحاظ سے متاثر کرتا ہے۔ اسی طرح مضمون کے تمام حصوں میں ایک مسلسل ربط و تسلسل ہوتا ہے جو اس کو بے قاعد ہونے اور بے ربطگی سے دور رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں مضمون لکھنے والے کے خیالات و جذبات کی عکاسی ایسے انداز میں کرے کہ اس کی زندگی کے نظریے کی چھاپ نظر آئے۔ گویا مضمون کو مضمون نگار کی ذاتی شخصیت، خیالات و تاثرات، اخلاق و عادات کو اس کا ترجمان اور عکاس ہونا چاہیے۔

آٹھویں صدی سے تقریباً گیارویں صدی تک جنوبی ہند کے علاقے میں اردو نثر میں بہت سے مذہبی کتب اور رسائل موجود ہیں جہنوں نے اس میدان میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ دکن کے کچھ خاص علاقوں میں جغرافیائی حالات و واقعات بھی اردو زبان کے حق میں فائدہ مند ثابت ہوئے۔ اور نظم کے میدان خاصہ ذخیرہ جمع کر لیا۔ جن میں سب سے اولین نام معراج العاشقین کا ہے، معراج العاشقین میں حضرت شیخ

عین الدین گنج العلم، حضرت خواجہ گیسو دراز بندہ نواز کا زمانہ حیات ۷۲۰ھ ہجری سے ۸۲۰ھ ہجری تک کا حال احوال بیان ہوا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں فارسی زبان کا دور دورہ تھا۔ اردو نثر ابھی ارتقاء کی منازل طے کر رہی تھی اس میں اردو نثر کے جملوں کا انداز بالکل ویسا ہے جیسا فارسی زبان میں موجود تھا۔ سب سے اہم بات مضامین کے حوالے سے اگر دیکھی جائے تو وہ یہ ہے کہ مضامین لکھنے کا آغاز و ارتقاء مغرب سے ہوا لیکن اردو زبان میں یہ باقاعدہ طور پر دلی کالج سے نمودار ہوئے جس کا قیام ۱۸۲۵ء میں ہوا۔ پھر فورٹ ولیم کالج ۱۸۰۰ء کے ساتھ ہی عربی فارسی کے اثرات کم حیثیت ہونے لگے اور اس کی جگہ جدید دور کے تقاضوں کے مطابق انگریزی زبان نے لے لی اور پھر اس انگریزی نے رفتہ رفتہ سب زبانوں پر اپنے اثرات مرتب کرنا شروع کر دیئے۔ اس دور میں نثر کو فروغ سب سے بڑے ادیبوں اور مصنفوں کی بدولت ہوا کیونکہ وہ سب مغربی ادب سے استفادہ کر رہے تھے۔ موضوعاتی حوالے سے اگر دیکھا جائے تو پہلے پہل جتنے بھی مضمون نگار تھے۔ انہوں نے مغربی مضمون نویسوں سے بہت زیادہ نقل کی لیکن ایک نئی صنف ادب ہونے کی وجہ سے سب سے اس پر مثبت اثرات ثبت کئے اور نثر پڑھنے والوں کے لیے نیا مواد دستیاب کیا۔

فورٹ ولیم کالج میں نثری ادب کو فروغ گلکرائسٹ کی کوششوں سے ممکن ہوا۔ گلکرائسٹ نے آسان سادہ اور عام فہم زبان میں نثر کی بہت سی کتب کے تراجم کئے۔ "فسانہ عجائب " کے مقدمے میں سب سے پہلے شعری آہنگ میں آسان اور سادہ نثر لکھی گئی ہے۔ اردو نثر میں اس قصے کی زبان اگلے نئے آنے والے اردو مجموعوں کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ خود میر امن اس کے بارے میں لکھتے ہیں۔ میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا، جیسے کوئی باتیں کرتا ہے حتیٰ کہ میر امن کے مقدمے میں کسی حد تک مضمون نگاری کا گمان ہوتا ہے کیونکہ اسی کے ذریعے زبان و ادب نے مضمون نویسی کے ابتدائی خدوخال تلاش کیے۔ لیکن باقاعدہ آغاز اردو زبان میں دلی کالج سے ہوتا ہے۔ لیکن آسان اور رواں و سلیس عبارت فورٹ ولیم کالج کا خاصہ ہے۔ دلی کالج کا سب سے اہم کام جدید سائنسی علوم کو فروغ دینا تھا۔ اسی کالج کی وجہ سے اردو زبان میں جدید سائنسی علوم پر مبنی کتب شائع ہونے لگی۔ تہذیب الاخلاق رسالہ جو کہ سر سید کی تخلیق ہے ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار اردو مضمون نگاری کو انگریزی مضمون نگاری کے مواح اور تقلیدی پہلو سمجھتے ہیں۔ ان کے

مطابق اردو مضمون نویسی انگریزی مضامین نویسی کے زیر اثر رہ کر انیسویں صدی میں ارتقاء پذیر ہوئی اور وہ سر سید احمد خان کو اردو کا سب سے اولین مضمون نگار سمجھتے ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی بھی ان کی بات سے اتفاق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

> اردو میں مضمون نگاری کا باقاعدہ آغاز سر سید احمد خان سے ہوا۔ انہوں نے مذہبی، سیاسی، ادبی، علمی، معاشرتی، تاریخی، فلسفیانہ اور دیگر موضوعات پر بکثرت مضامین لکھ کر ہم عصر ادیبوں کو ایک نیا راستہ دکھایا۔[۱۶]

درج بالا اقتباسات کا اگر بغور جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جتنے بھی محقق و دانشور مضمون نگاری اور اس کے ارتقاء کے بارے میں اپنی آراء کا اظہار کرتے رہے ہیں ان لوگوں نے دلی کالج کی خدمات فراموش کر دی کیونکہ اگر وہ مضمون نگاری کے ارتقاء کی تلاش کرتے تو بلا شک و شبہ سیدہ جعفر کی رائے کے بغیر ہی دلی کالج کے مضمون نگاروں سے سب کو بخوبی علم ہوتا۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر غلام حسین نے بھی ان کی بات سے اتفاق ظاہر کیا ہے کہ اردو کے اولین مضمون نگار ماسٹر رام چندر ہیں نہ کہ سر سید۔ سر سید کو ایک حد تک ادبی مضمون نگار کی حیثیت دی جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ ڈاکٹر سیدہ جعفر نے یہ بات پوری تحقیق کے ساتھ کی ہے اور اسے بیان بھی کر رہی ہیں کہ ان کے مضامین منظر عام پر نہیں آئے تو زیادہ تر ادیبوں نے سر سید کو پہلا مضمون نگار قرار دے دیا۔ ان کے مطابق سر سید خود بھی اس حقیقت سے ناآشنا ہی رہے اور خود کو اولین مضمون نگار ہی خیال کرتے رہے۔ بقول سیدہ جعفر:

> یہ معلوم کر کے بڑا تعجب ہوتا ہے کہ سر سید اپنے مضامین کو مضمون نگاری کے اولین نقوش سمجھتے تھے۔ یا تو ماسٹر رام چندر کے مضامین ان کی نظر سے نہیں گزرے تھے یا پھر وہ ان تحریروں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔[۱۷]

یہ بات بھی کہی جا سکتی ہے کہ سر سید دلی کالج کی اندرونی سرگرمیوں سے خاصی واقفیت نہیں رکھتے تھے۔ نہ ہی ان کی رسائی ماسٹر رام چندر کے مضامین تک تھی۔ یہ بات بھی سوچی جا سکتی ہے کہ لنڈن کے سفر سے پہلے مضمون نویسی ان کے لیے کوئی خاص معنی نہ رکھتی ہو لیکن انگلستان کے لوگوں کی مضمون کی طرف رغبت دیکھ کر اور سٹیل اور ایڈیسن کی سوچ کو لے کر ایک نئی چوچ ذہن میں ابھری ہو اور ہندوستان میں اس

صنف کو متعارف کرنے کی ترغیب ذہن میں آئی کیونکہ وہ بنیادی طور پر معاشرے میں اصلاح و تبدیلی لانے چاہے تھے کواہ وہ کسی بھی طریقے سے ممکن ہو۔ کیونکہ وہ انگریزی مضمون نگاری سے متاثر ہو کر لکھ رہے تھے۔ تو ماسٹر رام چندر نے بھی انگریزی ادیبوں سے متاثر ہو کر مضامین لکھے۔ رام چندر دلی کالج میں پڑھتے رہے اور بعد میں وہیں پر الجبرا کے استاد مقرر ہو گئے۔ ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ اور مولانا محمد حسین آزاد ان کے شاگردوں میں سے تھے۔ لیکن سب سے حیران کن بات یہ ہے کہ سر سید نے نہ کہیں دلی کالج کا ذکر کیا اور نہ ہی ماسٹر رام چندر کی ادبی خدمات کا کہیں نام لیا۔ سیدہ جعفر اس بات پر اعتراض بھی کرتی ہیں کہ یہ بات ممکن نہیں کہ سر سید نا آشنا تھے کیونکہ ان کے بھائی شنکر داس کے ساتھ سر سید کا بڑا باز نہ تھا۔

جو بات بھی سی سید کی کی جائے لیکن یہ بات بلاشبہ تسلیم کی جائے گی کہ سر سید نے اپنے زور قلم کے ذریعے اور اپنے عقل و امر کے ذریعے ایک بہت بڑی جماعت تیار کی۔ سر سید کے کچھ مضامین بہت مختصر اور ناتمام ہیں اور بعض مضامین میں مسائل میں سے کسی اک مسئلے پر زیادہ تفصیلاً بات کی ہے کہ کسی حد تک سر سید کو اصلاح معاشرہ کا بانی بھی کہا جا سکتا ہے گو کہ ان کے بعض مضامین اپنی اصل کے اعتبار سے ادبی مضامین کے زمرے میں نہیں شامل ہوتے۔ لیکن پھر بھی سر سید کا علمی ادبی حوالے بہت اہم کردار ہے۔ انہوں نے اردو مضمون نگاری میں گراں بہا کارنامے انجام دیئے۔ تیسرا بڑا نام مولانا آزاد کا ہے اور ان کے بعد ڈپٹی نذیر احمد نے نثر کے میدان میں اپنا نام پیدا کیا۔

انیسویں صدی تک مضمون نگاری کے میدان نے خاصی وسعت پیدا کر دی۔ گاہے گاہے تبدیلیاں بھی رونما ہوتی رہیں جو کہ اردو نثر میں مثبت ثابت ہوئیں۔ سر سید کے معاصرین اور رفیقان نظر میں زیادہ تر کا تعلق دلی کالج سے ہی تھا۔ جنہوں نے اردو زبان کو جدید پیرائے میں سلیس ،سادہ،رواں بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

مسلمانوں میں ترجمہ اور تقابل کی روایت:۔

سائنس کا بنیادی اصول نظریہ قائم کرنا، پرکھنا، تجزیہ کرنا اور مشاہدہ کرنا وغیرہ ہیں۔ چنانچہ اس وقت جبکہ دنیا کی کم و بیش تمام آبادی جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مسلمانوں نے ترجمہ اور تقا

بل کی وہ روایات قائم کیں اور انہیں سائنس کے ایسے اصولوں پر استوار کیا جو بعد میں یورپی اقوام کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوئے۔

یوں تو بنو امیہ کے سو سالہ بادشاہت میں ترجمے اور تقابل کو فروغ حاصل ہوا لیکن ایک مخصوص ذہنی کیفیت اس دور میں بادشاہوں کو گھیرے رکھے ہوئے تھی جس نے فلسفے اور سائنس کو معاشرے پر بری طرح اثر انداز ہونے سے روکے رکھا۔ تاہم بنو عباس کے دورِ حکومت میں بالعموم اور ہارون الرشید کے ادوار میں یونانی زبان سے ترجمے کی روایت کو زبردست فروغ حاصل ہوا۔

یہ ترجمہ ہی تھا جس نے یونانی علوم کو عربی زبان میں محفوظ کرنے کی جانب ایک اہم اور بڑی پیش رفت کی۔ ہارون الرشید کے دور میں اونٹوں اور باربرداری کے جانوروں پر یورپ کے تمام حصوں سے بڑی تعداد میں مختلف علوم کی کتب بغداد اور اسکندریہ آئی۔

ماہرین زبان و ادب نہایت برق رفتاری سے تراجم کرتے۔ اسی دوران سیف عبدالرحمٰن نے جڑیں مضبوط کر لیں تھی اور یورپ مسلم اقتدار کی وجہ سے زبردست تبدیلیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ خلیفہ الناصر بالخصوص تراجم کا بڑا ذوق رکھتا تھا۔ اور اس مقصد کے لیے کثیر رقم خرچ کرتا تھا۔ فرانس اور انگلستان کے کتب خانوں میں اس زمانے کے مخطوطات پر خلیفہ حاشیے ان کی ذکاوت اور علم و ادب اور دوستی کے آئینہ دار ہیں۔

ترجمہ اور تقابل کی روایت زبانوں میں زبردست انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ مغربی ماہرین نے مسلمانوں سے حساب اور سائنس میں رہنمائی حاصل کی بلکہ ہندی اور یونانی زبان کے عربی میں ترجمہ شدہ ادب کو اپنی زبانوں میں ترجمہ کرنے میں زبردست دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور ترجمہ اور تقابل کی روایت نے ان زبانوں کو وسعت دینے اور معانی و مطالب میں اضافے کا سبب بننے میں اہم کردار ادا کیا۔

مغل بادشاہوں کی ادب دوستی تو تاریخی شہرت کی حامل ہے۔ ایران میں شاہ اسماعیل صفوی کی حکومت کے قیام کے بعد بہت سے ترجمہ نگاروں، شعرا اور ادیبوں نے ہندوستان کا رخ کیا اور یہاں جلال الدین اکبر کے دربار میں شہرت حاصل کی۔ چونکہ ایران میں مغوی حکومت کے قیام کے بعد مرثیہ کو فروغ حاصل ہوا۔ اس لیے غزل اور قصیدہ گو شعراء کو ہندوستان جائے پناہ نظر آیا۔ اکبر کے دور سے ہندوؤں اور

بدھ مت کے پیروکاروں کی کہانیوں اور داستانوں اور ناٹکوں کو اردو اور فارسی میں ترجمہ کرنے کا کام جڑ پکڑ چکا تھا۔ اس طرح ہندوستان کے قدیم ادیب اور جدید ادب کے درمیان ایک پل کے قیام میں مدد ملی۔

ہ) مغرب میں تقابل کی روایت:

ادب خواہ اس کا تعلق شاعری سے ہو یا نثر سے انسانی زندگی کا ایک لازمی حصہ رہا ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں میں شعری اور نثری ادب موجود ہے اور ادب کے یہ فن پارے انسانی تجربات، روایات اور رسوم و رواج کے عکاس ہیں۔ دنیا کی تمام دیگر زبانوں کے ادب کی طرح اردو ادب ہمیشہ سے مختلف تحریکوں کے نتیجے میں تبدیل ہوتا رہا ہے۔ اردو ادب میں جدید نثر کی بنیاد اٹھارویں صدی عیسوی میں پڑی جب یورپی اقوام نے ہندوستان کے ذرائع پیداوار کی فراوانی کو دیکھتے ہوئے اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ فرانسیسیوں ،ولندیزیوں، پرتگیزیوں کے برعکس انگریز برصغیر کو تادیر اپنی کالونی بنانے میں کامیاب رہے لہٰذا اردو ادب میں تقابل کی روایت بھی انگریزی سے آئی۔

تقابل ادب کا موضوع اٹھارہویں صدی سے ہی یورپ میں عام رہا ہے اور فرانسیسی، امریکی اور روسی مکتبہ ہائے فکر نے اپنے طور پر تقابل ادب کی دبستانوں کو ترقی دی تقابلی ادب کا موضوع اس لحاظ سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے کہ اس کی مدد سے ہم نہ صرف زبان و ادب پر پڑنے والے اثرات کا بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں بلکہ یہ سراغ لگانا بھی ممکن ہے کہ مختلف اوقات میں ادبی فن پاروں کی تخلیق کے وقت تہذیب و تمدن ،روایات، زبان اور تاریخ کے کن دھاروں نے مصنف کے ذہن کو متاثر کیا۔ اردو ادب میں تقابلی روایت زیادہ پرانی نہیں جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ فارسی کو برصغیر کے طول و عرض سے سرکاری زبان ہونے کی کلّی اہمیت حاصل تھی اور اس زبان میں گفتگو، خط و کتابت اور دیگر سرکاری امور انجام دیئے جاتے تھے لہٰذا ۱۷۰۶ء میں اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد جب مغل شہزادوں کی آپسی لڑائیوں میں ملکی معیشت تباہ و برباد ہو گئی تو استعماری طاقتوں کے لیے اس ملک پر قبضہ کرنا آسان تر ہوتا چلا گیا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے برصغیر پر مکمل قبضہ جمایا اور چھوٹی موٹی بغاوتوں کے علاوہ باقی تمام ملک ان کے استعماری جبر و استبداد تلے آ گیا۔

فورٹ ولیم کالج کی بنیاد رکھے جانے کے بعد بہت سے مسلمان اور غیر مسلم ہندوستانیوں میں انگریزی ادب سے بہرہ مند ہونے کی خواہش پیدا ہوئی اور یوں اردو ادب میں انگریزی سے متاثرہ نظم اور نثر کے علاوہ تقابلی ادب کی بنیاد اسی وقت پڑی۔ انگریزی ادبی فن پاروں اور تحقیق و تنقید کا مطالعہ مسلمانوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا۔ سر سید اور ان کے رفقاء نے انگریزی ادب سے مستعار لیے گیے اصناف ادب کے علاوہ تقابلی ادب میں بھی کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس طرح کی فضا میں تقابلی ادب کا موضوع نسبتاً نیا اور اچھوتا تھا لہٰذا سر سید تحریک کے زیر اثر لکھے جانے والے ادب میں عدل و انصاف کے تقاضوں کو سامنے رکھا گیا۔ اردو ادب میں جب ہم تقابل کا جائزہ لیتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ مقدمہ شعر و شاعری،، از مولانا حالیؔ ہو یا شبلی نعمانی کا موازنہ انیس و دبیر، پر دو کتابوں میں عدل و انصاف کے پیمانوں سے انحراف کیا گیا۔ چونکہ یہ اردو ادب میں اس روایت کا آغاز تھا اور اس سے پہلے مذکورہ ادب میں اس قسم کی کسی روایت کی دور دور تک گنجائش نہیں تھی لہٰذا تقابلی ادب کے حوالے سے لکھی جانے والی اولین کتب میں اس قسم کی فاش غلطیوں سے صرف نظر کیا جا سکتا ہے۔

اردو کے ابتدائی ادب کو دیکھا جائے تو اس میں نثر سے زیادہ نظم یا پابند شعری ادب نظر آتا ہے۔ اردو میں اکبر کے زمانے سے ہی تذکرہ نویسی کو خصوصی اہمیت حاصل تھی اور مختلف وزراء اور درباری شخصیات نے تذکرے لکھ کر نہ صرف اپنے وقت کے مقتدر شاعروں کا موازنہ کیا بلکہ بعد میں آنے والوں کے لیے ایک مثبت اور قابل اصلاح روایت چھوڑ گئے۔ انگریزوں کے ہندوستان آنے کے بعد بھی بہت سے تذکرے لکھے گئے۔ ان تذکرہ نویسوں میں انشاء اللہ خان انشاء سے لے کر شیفتہ جیسے تذکرہ نویسوں نے حصہ لیا لیکن یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ ان تذکروں میں شاعروں کے فنی محاسن پر بحث سے زیادہ مخالفین کے استاد شعراء کو نیچا دکھانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اور اکثر تذکرے اسی دور میں ادیبانہ رقابت کے زمرے میں تحریر کیے گئے لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ موازنہ انیس و دبیر اور مقدمہ شعر و شاعری میں جدید انداز میں جذباتی ہوئے بغیر تقابلی ادب کی روایت کو فروغ دینے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

تقابلی ادب سہل کام نہیں کیونکہ اس موضوع کے لیے کم سے کم دو زبانوں کے ادب پر اور ان زبانوں کے بولنے والوں کی روایات سے مکمل آگاہی بھی ایک بنیادی امر ہے، تقابلی ادب میں دو زبانوں کے فن پاروں کو یا ایک ہی زبان کے دو فن پاروں کو مقابل رکھا جاتا ہے اور ایک معیاری ادبی فن پارے کا خاکہ ذہن میں لے کر دونوں ادبی فن پاروں میں موازنہ کیا جاتا ہے۔

بیسویں صدی پہلے ربع میں جب یورپی اقوام کے درمیان صنعتی ترقی اور اپنے ملک کو امیر بنانے کی دوڑ شروع ہوئی تو اس کی خاطر ذرائع آمدورفت کے نئے طریقوں کو کھوجا گیا علاوہ ازیں صنعتی ترقی میں اسلحہ سازی میں ایک انقلاب برپا کر دیا اسی سبب ۱۹۱۴ء میں اپنے اختتام کو پہنچی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد فرانسیسی مکتبۂ فکر یا بالالفاظ دیگر فرانسیسی دبستان میں حب الوطنی کے جذبے کو نئی جہت ملی اور ادب کے توسط سے حب الوطنی کے جذبات کو ابھارنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔

۱۹۱۹ء میں پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر بے پناہ نقصان اٹھانے کے بعد یورپی اقوام کا خیال تھا کہ اب دوسری جنگ کی نوبت نہیں آئے گی۔ لیکن یہ خیال خام ثابت ہوا اور ۱۹۳۹ء میں دنیا دوسری جنگ عظیم کے دھانے پر پہنچ گئی۔ ۱۹۴۵ء میں دو ایٹمی دھماکوں کے بعد بالآخر لاکھوں جانوں اور بے شمار دیگر نقصان کے بعد یورپ اور امریکہ نے جنگ سے ہاتھ کھینچ لیے۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۵۰ء تک کا زمانہ دنیا میں غاصبانہ استعماری طاقتوں کے زوال کا زمانہ تھا جب فرانس اور برطانوی حکومتوں کے مقبوضات یکے بعد دیگرے ان کے ہاتھ سے نکلنے لگے۔ اس دوران عظیم ادب وجود میں آیا۔ یہ بات حیران کن حد تک صحیح ہے کہ برصغیر میں مغل سلطنت جیسے جیسے زوال پذیر ہوتی گئی ویسے ویسے اردو ادب عروج کی سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ تقابلی ادب کے موضوع کو یورپ میں قبول عام حیثیت پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد حاصل ہوئی جب یورپی اقوام نے کمزور ایشیائی افریقی اور امریکی ایڈانڈین اقوام پر بزور طاقت قبضہ جمالیا۔ ان اقوام نے ایشیا اور افریقہ کو ذہنی لحاظ سے بانجھ بنانے کے لیے ان کی لائبریریوں اور تعلیمی مراکز کو تباہ کر دیا۔ آج بھی اردو کی کئی نایاب کتب اور قلمی تصنیفات لندن اور جرمنی کے کتب خانوں میں موجود ملتی ہیں۔ یعنی اب محققین اپنی ہی زبان کے حوالے سے تحقیق کرنے کے لیے ان ممالک میں جایا کریں۔ جب بڑی تعداد میں ادبی نسخے انگریزوں کے ہاتھ لگے تو انہوں

نے ہندوستانی اقوام کی سوچ سے آشنائی حاصل کرنے کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا اور یوں دو زبانوں کے ادب پر عبور رکھنے والے محققین نے جنم لیا۔

مغرب میں تقابل کی تاریخ:۔

مغرب میں تقابل کی تاریخ میں سب سے اہم مکتبہ فکر ہیں جو کہ درج ذیل ہیں:

تقابلی ادب، ابتدائی کام:۔

تقابلی ادب میں جس کام کو بنیادی حیثیت حاصل ہے اُس میں (Transy Ivanian Hungarian sholarship (z'Hugo Meltzl de Lomnitz شامل ہے۔ اس کے علاوہ درج ذیل جر نل کے(Acta comparatonis Litterarum univer sarumm 1877)اور آئرلینڈ کے محقق(H.M. Posnett's)نے اپنے رسالہ میں(1886)میں اس کام کو تقابلی ادب کی بنیاد کے طور پر شامل کیا۔

فرانسیسی مکتبہ فکر:۔

بیسویں صدی کے آغاز سے دوسری جنگِ عظیم تک فرانسیسی مکتبہ فکر میں ایسے ادیب اور محقق شامل رہے جو علم کو سابقہ تجربات اور مشاہدات کا نتیجہ قرار دیتے تھے اس سوچ کو (French school of thought)کہا جاتا ہے۔

فرانسیسی مکتبہ فکر کے مطالعہ میں اثرات اور زہنیت کا غلبہ رہا۔ موجودہ دور میں فرانسیسی مکتبہ فکر میں قومی، ادبی سوچ کے ساتھ ساتھ یورپین متقابلی ادب کو بھی ترجیح دی جاتی ہے۔

جرمن مکتبہ فکر :۔

فرانسیسی مکتبہ فکر کی طرح جرمن کا آغاز بھی انیسویں صدی کے اختتام پر ہوا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جرمن تقابلی ادب میں ترقی کا سہرا جس ادیب کے نام جاتا ہے وہ(Peter Szondi)، (1929-1971)ہے۔

امریکن مکتبہ فکر :۔

فرانسیسی مکتبہ فکر پر ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے دوسری جنگِ عظیم کے بعد آنے والے زمریکی ادیبوں نے اجتماعی طور پر ادب میں بالواسطہ تنقید کو اہمیت دی۔ امریکی مکتبہ فکر کے آغاز سے پہلے تقابلی ادب صرف مغربی ادب تک محدود تھا۔

مولانا آزاد اگرچہ تحریک علی گڑھ سے وابستہ تھے مگر انہوں نے اس تحریک کے ساتھ رہتے ہوئے بھی اپنا راستہ الگ بنایا۔ طبعی میلان اور انجمن پنجاب کے تحت دیئے گئے ان کے خطبات سے ان کی تنقید اور تقابلی صلاحیتوں کا مکمل اظہار ہوتا ہے۔

الطاف حسین حالی کی مقدمہ "شعر وشاعری" ویسے ایک مختصر تصنیف ہے جس میں ادب کے مختلف موضوعات پر جدید انداز کی تنقید ملتی ہے۔ مگر یہ کتاب موضوعات اور تحریر کے اچھوتے پن کی وجہ سے آج بھی بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے، انگریزوں کی بے جامدح سرائی اور انگریزی پن میں اضافہ کیا ہے۔ مگر اس کے موضوعات نے اس کو اردو تنقید کے ایک شاندار ورثے میں بدل دیا ہے۔

حالی نے اس مقدمے میں انگریزی، فارسی اور اردو کے کلاموں اور نیچرل شاعری پر اپنے تنقیدی خیالات کا کھل کر اظہار کیا ہے جس نے ادب میں تقابل کی روایت کو پروان چڑھانے میں " مقدمہ شعر وشاعری" کو سب سے اہم نقش بنادیا ہے۔

حالی لکھتے ہیں کہ:

> یہ ممکن ہے کہ کسی قوم کے خیالات میں دفعتاً ایک نمایاں ترقی اور وسعت پیدا ہو جائے، مگر زبان میں دفعتاً وسعت پیدا نہیں ہو سکتی، بلکہ نا معلوم طور پر بیان کے اسلوب میں آہستہ آہستہ اضافہ کیے جاتے ہیں۔ [۱۸]

انجمن ترقی پنجاب میں دیئے جانے والے خطبات بھی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو نثر کا تنقیدی و تحقیقی تجزیہ کیا جائے تو اُس وقت یہ تحریک تاریکی گھٹاٹوپ اندھیرے می گم تھی۔ اس کے فروغ میں آزاد کا بہت بڑا حصہ پایا جاتا ہے۔ اور انھی کی وساطت سے اردو نثر کو مقصدیت سے آگہی حاصل ہو سکی۔

> تقریری زبان تحریری زبان سے بالکل علیحدہ ہے۔ سادہ اور روزمرہ کے جملے جو ہر وقت زبان پر چڑھے ہوتے ہیں تحریر میں آتے وقت فارسی زبان سے بدل جاتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کی جدت، عظمت اور شانداری ہے۔[19]

عموماً کچھ لوگ اردو زبان کو فارسی زبان کا ہی ایک شجر سمجھتے ہیں کیونکہ اردو کی شاعری میں بحریں، رسم الخط اور دیگر الفاظ بکثرت پائے جاتے ہیں۔

یہ انجمن ایک سال کے قلیل عرصے میں کی شاعری کو ختم کر کے ایک نئے رخ کی طرف موڑنے لگی۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انجمن پنجاب نے شاعری کو ایک باقاعدہ شعوری آگہی دی۔ آزاد کا ایک اور تعارف تذکرہ نویسی سے بھی ہے لیکن اس کی دوسری پہچان محقق کے طور پر کی جاتی ہے۔ وہ تحقیقی نگارش سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ آزاد لکھتے ہیں کہ:

> جب صاحبِ زبان قومیں ملتی ہیں تو ایک کے رنگ و روپ کا دوسرے پر سایہ پڑتا ہے۔۔۔۔۔ جب مہمان اور میزبان ایک دوسرے کی زبان سمجھنے لگتے ہیں تو ایک خوش نما اور مفید تبدیلی کے لیے راستہ پیدا ہو جاتا ہے۔[20]

حالی اور آزاد کے بعد بہت سے شعراء نے نظم نگاری کے امکانات کا شعور دیا ہے۔ ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ آزاد نئے الفاظ کو استعمال کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔

> تحریک انجمن پنجاب ایک جامع، ہمہ جہت اور مکمل ادبی تحریک تھی۔ اس تحریک نے اردو نظم اور نثر دونوں کو یکساں طور پر متاثر کیا۔[21]

تقابل ادب کا موضوع برصغیر پاک و ہند میں ابتدا میں سر سید تحریک کے زیر اثر شروع ہوا جب تہذیب الاخلاق کے عنوان سے چھپنے والے رسالے میں ایک جانب اردو اور دوسری جانب ان کا انگریزی

ترجمہ تحریر کیا جاتا تھا تا کہ پڑھے لکھے اور بالا دست طبقے کو انگریزی زبان و ادب سے آشنا کرانا تھا۔ ان کی تحریک اس طرح سے کامیاب ہوئی کہ ان کی زندگی میں ہی اردو زبان میں موازنہ انیس و دبیر،، از شبلی نعمانی اور مقدمہ شعر و شاعری از مولانا حالی لکھے گئے یورپی اقوام میں تقابل ادب کا موضوع کافی پہلے کا ہے۔ کیونکہ انہوں نے اس کی مدد سے ادبی شہکاروں کی قدر و قیمت کے علاوہ فنی محاسن اور تاریخ کا سراغ لگانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ تقابلی ادب کا موضوع کسی ادبی فن پارے کو دوسرے سے برتر یا کم تر ثابت کرنا نہیں بلکہ اس کا مقصد تاریخی لوازم کو سمجھتے ہوئے ان فنکاروں کی بہتر سمجھ پیدا کرنا ہے کیونکہ دو ادبی فن پارے جن میں تقابل کیا جا رہا ہو مختلف تہذیبی اداروں سے تعلق رکھتے ہیں ان میں تقابل کرنے کا مقصد ان تہذیبوں ،وہاں کی سوچ، رسوم و رواج سے بہتر آگاہی پیدا کرنا ہے۔

میلز کہتے ہیں کہ تقابلی ادب کو کسی ادبی روایت کے مطالعے ،اس کا بناوٹ، تاریخی ترویج و ترقی اور زبانوں کے مابین تعلق سے کم یا زیادہ نہیں ہونا چاہیے۔

ہم بہتر سمجھ کے لیے جنگ عظیم دوم کے اثرات یورپی ادب کے تقابل کے مطالعے سے حاصل کر سکتے ہیں۔ کیونکہ جنگ کے دوران لکھا گیا ادب انسانی رویوں اور تہذیبی ٹوٹ پھوٹ اور اس میں کار فرما عوامل کی بہتر نشاندہی کر سکتا ہے۔ بیسویں صدی سے قبل ہی یورپ میں صنعتی انقلاب اپنے مضبوطی سے جما چکا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جہاں جنگیں ہوئیں وہاں سائنسی ترقی نے بھی لوگوں کے رویے ہمیشہ کے لیے تبدیل کر دیے۔ سائنسی نقطہ نظر کے مطابق چیزوں کو جذباتی نقطہ نظر کے بجائے سائنسی اور منطقی انداز کے مطابق دیکھا جانا چاہیے اسی وجہ سے تینوں مکتبہ فکر اگرچہ ایک دوسرے سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ مگر منطق کے نقطہ نظر پر امریکی، جرمن اور فرانسیسی مکتبہ ہائے فکر ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں۔ فرانسیسی مکتبہ فکر پر اور انداز میں اس بات پر زور دیتا ہے کہ زبان کا مطالعہ چاہے حقیقت پسندانہ ہو یا تقابل کی بنیاد پر ہر دو صورت میں موازنہ کی روایت کو برقرار رہنا چاہیے۔ جرمن مارکسسٹ، تنقید میں فرانسیسی مکتبہ فکر کے اس نقطہ نظر سے اختلاف کرنے یا اس نقطہ کو معطل کرنے میں زیادہ تحقیق کی ہے کہ دونوں چیزوں کو ثابت کیا جانا چاہیے نہ کہ صرف بیرونی معائنے پر گزارہ کیا جائے۔

سوزن بیسنٹ لکھتی ہیں کہ:

> Probably the most original constellation of British comparative Literature is the concept of placing, the juxtaposing of text in order to creat new reading areas culture.[۲۲]

ان کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ انگریزی مکتبہ فکر کی عطاء جو تقابلی ادب میں انجام دی گئی چیزوں کی اپنی جگہ ترتیب پر رکھنا ہے جس کی مدد سے ایک ہی نظر میں خامیوں اور خوبیوں کو یک جا دیکھا جا سکتا ہے۔ ادب کی بدلتی صورت حال کا جائزہ امریکہ ،یورپ اور دولت مشترکہ کے ممالک کا قدیم ادبی اور سائنسی سرمائے کا دوبارہ جائزہ لینا ان سب کا تعلق بیسویں صدی سے تھا جب عقل اور منطق پر مبنی معاشرے کے قیام کے بعد مغربی مفکرین نے قدیم تسلیم کیے گیے نظریات کی دوبارہ پرکھ کا آغاز کیا۔ رینے ویلک کے مطابق تاریخ تقابلی ادب میں مرکزی حیثیت کی حامل ہے۔

وہ مزید کہتی ہے کہ تقابل ادب کا موضوع وسع النظری، علم اور تجربے کے ساتھ ساتھ شخصیت کا مطالعہ بھی پیش کرتا ہے۔ تقابل ادب سے متعلق تمام مکتبہ ہائے فکر مختلف ہیں۔ تقابل ادب کا موضوع ادب کے آزاز مطالعے لسانیات اور زبان کے نسلی و سیاسی بنیادوں سے بحث کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے تقابل کرتے وقت دیگر غیر متعلقہ رجحانات اور عوامل ہماری شخصیت پر اثر چھوڑیں جیسا کہ:

وہ ثبوت اور رجحانات جو دوران مطالعہ یا موازنے کے ووقت سامنے آتے ہیں۔

ادب کے موازنے میں مغربی تقابل ادب کے مفکرین کا نقطہ نظر اور طریقہ کار عام طریقہ کار سے بلکل الگ اور چھوٹا ہے۔ مغربی مفکرین ہندوستانی یا افریکی ادب کی اصطلاحات کو بہت وسیع پیمانے پر اور مختلف سوچ کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ ادب کو مضبوط کرنے والی مقامی حدود قیود سے لاعلم ہوتے ہیں۔ ادبی اصولوں کے مغربی نمانے نظریات اور تقابلی ادب کی عالمانہ تاریخی تحقیق ہندوستانی ادب کے موازنہ کاروں کو مغرب کا طریقہ اور اصول اپنانے کا مشورہ دیتے ہیں۔

اردو ادب میں تقابل کی روایت:

اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد مغل سلطنت کے وارثوں کے درمیان مسلسل لڑائیوں کی وجہ سے ملکی معیشت اور معاشرت بری طرح برباد ہو گئی۔ اورنگزیب عالمگیر کی مذہبی پالیسیوں کے علاوہ انہیں جہان بانی کا بھی بڑا شوق تھا۔ اور اسی وجہ سے تین سو سال سے ذائد ہندوستان کی باقی سرزمین سے علیحدہ مگر بڑا حصہ یعنی جنوبی ہند البر کے بعد اورنگزیب کے عہد حکومت میں دوبارہ فتح کیا گیا۔ بہت زیادہ لشکر کشیوں کے سبب مغل افواج تھکاوٹ کا شکار ہو گئیں اور ان کی وفات کے فوراً بعد ملک کے مختلف حصوں میں پھیلی افواج کی وجہ سے مرکزی حکومت کمزور ہو گئی اسی دوران مختلف یورپی ممالک کے طالع آزماؤں نے ہندوستان کا رخ کیا اور ۱۷۰۶ء سے لے کر ۱۷۹۹ء تک پورے ہندوستان پر تاج برطانیہ کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء میں مغل بادشاہ کی انتہائی کمزور حیثیت کے باوجود مسلمانوں سمیت دیگر اقوام نے انگریزوں کا پنجۂ استطاعت سے جان چھوڑانے کے لیے جنگ آزادی لڑی۔ جس میں انگریز حسب معمول اپنی ریشہ دوانیوں کے سبب کامیاب رہے اور ہندوستانی اقوام بشمول مسلمانوں کی مزاحمت کرنے کی قوت مکمل طور پر ختم ہو گئی۔

انگریز سرکار نے ہندوستان پر تادیر قبضہ جمائے رکھنے کی منصوبہ بندی کی تاکہ ہندوستان کی صنعتی اور زرعی ضروریات کے لیے وافر مقدار میں سرمایہ میسر کیا جا سکے تو دوسری جانب اپنے صنعتی پیداوار کی ہندوستان کی منڈیوں میں کھپت پیدا کی جائے۔

یوں تو فورٹ ولیم کالج کے قیام کے ساتھ ہی اردو زبان میں ترجمہ اور تقابل کی روایت نے نئے سرے سے جنم لیا تھا تاہم اس سے قبل بھی تذکروں کی صورت مختلف شاعروں کے کلام کے تقابل کی روایت برصغیر میں وجود رکھتی تھی۔ فورٹ ولیم کالج سے جنم لینے والی تقابل روایت زیادہ پر اثر منطقی اور استدلالی تھی۔ جس نے آہستہ آہستہ ہندوستانی ادیبوں اور شاعروں کو متاثر کرنا شروع کر دیا۔ سر سید تحریک کے آغاز کے ساتھ ہی سرکاری سطح کے ساتھ ساتھ شخصیات اور غیر سرکاری اداروں میں بھی تقابل کی روایت کو مضبوط اور طاقتور بنانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ سر سید کے رفقاء مولانا حالی، محمد حسین آزاد، شبلی تعمانی اور ڈپٹی نذیر احمد تقابل ادب کے میدان میں نمایاں کامیابیاں حاصل کیں۔

علی گڑھ تحریک نے اردو ادب میں صحت مند تقابل کی روایت قائم کی۔ اول اول اردو شاعری پر انگریزی ادب کے اثرات نمایاں ہوئے تو نقد و تحقیق کا رویہ بھی عام ہوا اور محمد حسین آزاد نے ۱۸۶۴ء میں اردو شاعری میں تقابل اور تنقیدی لیکچرز دینے کی بنیاد قائم کی۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات کے عنوان سے جو تذکرہ تحریر کیا اس میں بھی جمالیاتی تنقید نمایاں نظر آتی ہے۔ اس تذکرے میں قدیم اردو اور فارسی تذکروں کی مانند شاعروں کی فن شاعری کا تقابل کیا گیا ہے۔

ذوق چونکہ محمد حسین آزاد کے استاد تھے لہٰذا اس تذکرے میں وہ ذوق کی فکر فن کی داد دیتے نظر آتے ہیں، یہی حال انشاء اللہ انشاء اور غلام مصطفیٰ شیفتہ کے تذکروں سے واضح ہوتا ہے کہ محمد حسین آزاد کے زیر اثر الطاف حسین حالی کی معرکت لاآ، تصنیف، مقدمہ شعر و شاعری، تقابل کی نئی روایت کی بنیاد ڈالتی ہے محمد حسین آزاد اور شبلی تعمانی کی تصنیف موازنہ انیس و دبیر،، میں ایک یکسانیت جمالیات کا ہوتا ہے دونوں ہی نقادوں نے تقد و تنقید اور تقابل سے زیادہ تحریر کے جمالیاتی خصوصیات پر زیادہ توجہ مرکوز کی اس کے باوجود بھی شبلی کے بعد تقابل کی روایت زیادہ توانا اور مضبوط نظر آتی ہے۔ قیام پاکستان کے بعد تقابل کی روایت زیادہ پر اثر دکھائی دیتی ہے جب اپنی جڑوں اور اپنی وطن سے محروم حساس دل ادیبوں نے شاعری میں وطن کی تلاش کا آغاز کیا اور اسلامی ادب کی تحریک شروع کی یوں ادب کے مابین کے لیے ایک نئے رویے اور موضوع نے جنم لیا۔ تقابل صرف تاریخی نوعیت کا ہی نہیں ہوتا بلکہ فن پاروں کو دوسرے طریقوں سے بھی پرکھا جا سکتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد محققین نقادوں اور ادیبوں نے نقد و تقابل کی جس روایت کو آگے بڑھایا اس میں نظریے کے ساتھ ساتھ ذہنی پس منظر اور مطالعہ ایک اہم جزو کے طور پر دکھائی دیتا ہے مثلاً بعض ترقی پسند نقادوں نے تقابل کی روایت کے پس منظر میں اپنے نظریے کو پیش نظر رکھا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ان جیسے ادیب مذہبی معاملات میں دخل نہ دینے کی پالیسی پر کار بند رہے اور اسی طور چند ادیب اور نقادوں مثلاً ڈاکٹر جمیل جالبی اور تبسم کاشمیری نے کسی ایک نظریے کو منتخب کر کے بقیہ دیگر نظریات پر مضحکہ اڑانے کی بجائے میانہ روی اختیار کی۔

اردو ادب میں مجموعی طور پر تقابل کا آغاز وارتقاء تذکرہ نگاری سے ہوتا۔

تذکرہ نگاری:

اردو ادب میں تقابل کی روایت کا آغاز تذکروں سے ہوتا ہے جو ابتدائی دور میں تحریر کیے گئے۔ ان تذکروں میں مختلف ادوار کے معروف شاعروں کا کلام اور اس کے فنی محاسن پر بحث کی جاتی ہے۔ نکات الشعراء ،تذکرہ الشعرائے اردو اور گلشن بے خار اسی قسم کے تذکروں کی مثالیں ہیں، کچھ تذکرے فارسی زبان میں بھی موجود ہیں، جن میں برصغیر کے بعض شعراء کا اردو نمونہ کلام دیا گیا۔

اردو میں تذکرہ کی روایت فنی محاسن کے بیان کے ساتھ ساتھ اپنے پسندیدہ شاعروں کے کلام کو دیگر شعراء سے برتر ثابت کرنے کے لیے لکھے گئے چونکہ اس نے بعد میں تقابل کے ایک مضبوط اور مستحکم روایت کی بنیاد رکھی لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ تذکرہ ہی دراصل تقابل کا وہ پیمانہ تھا جس میں مختلف شعراء کے کلام کو ایک دوسرے کے مقابل پیش کر کے اپنی بات کو ثابت کرنے کے حق میں دلائل دیے جاتے تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد لکھے جانے والے تذکرے پرانے تذکروں سے اس طور مختلف ہیں کہ ان میں کسی لگی لپٹی بات کے بغیر اپنی دلیل کو ثابت کرنے کے لیے تمام حربے استعمال کیے جاتے تھے۔ قبل ازیں فارسی کے تذکروں میں اس طرح کی بات نہیں پائی جاتی تھی اور اختلاف میں بھی تہذیب کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ ایک دوسری بات جو فارسی کے ہندوستانی تذکروں سے اردو تذکروں کو الگ کرتی ہے۔ وہ یہ کہ ان تذکروں کے معاصر شعراء کا کلام محفوظ کرنے کا کام بھی کیا جاتا تھا لیکن فارسی تذکرے بالعموم اس کام کے لیے وقف تھے جبکہ اردو تذکروں کو لکھتے وقت یہ مقصد ثانوی اہمیت کا حامل رہا۔

علی گڑھ تحریک نے اردو ادب کے مجموعی مزاج کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔ اس سے پہلے علی گڑھ تحریک اردو میں نثر کی وہ تحریک اور نمونہ جات موجود نہ تھے جو اسے بولی سے زبان میں تبدیل کر دیتے لیکن سر جون گلگرسٹ کی سرکردگی میں فورٹ ولیم کالج نے آسان ترجمے کی وہ روایت قائم کر دی جس نے اردو زبان کو جدید یورپی زبانوں کے برابر لا کھڑا کیا۔ سر سید احمد خان نے خود بھی اور ان کے قریبوں رفیقوں نے اردو میں تقابل کی روایت کو ایک نئے زاویے سے ہم آہنگ کر دیا۔ انگریزی ادب اور شاعری کا تقابل تو ترجمے کے ذریعے سر سید کے رسالے ,, تہذیب الاخلاق،، سے ہو چکا تھا لیکن شاعری میں ورڈزورتھ کی فطرت سے

متعلق شاعری کو کرنے سے محمد حسین آزاد بے حد متاثر تھے اور اسی کمی کو دور کرنے اور اردو شاعری کو تصورات سے نکال کر زمینی حقیقتوں سے آشنا کرنے کے لیے انجمن پنجاب کے سالانہ جلسوں میں اردو اور انگریزی شاعری کے تقابل پر کئی لیکچر دیئے اور یوں وہ جدید تقابل کرنے والے پہلے ادیبوں میں شمار ہوئے۔

سر سید کی تحریک سے وابستہ ایک اور قد آور شخصیت مولانا حالی بھی انگریزی کی جدید تحریکوں سے بے حد متاثر تھے اور یوں موسم، زبان، رسوم ورواج اور طبعی اور جغرافیائی تفرقات کے باوجود انہوں نے اردو اور انگریزی شاعری کا آپس میں موازنہ کیا۔ مولانہ حالی انگریزی ادب سے اس قدر متاثر تھے کہ بعض انگریزی اصطلاحات سے پوری طرح واقفیت نہ ہونے کے باوجود انہوں نے محض اپنی شہرت اور قابلیت کے اظہار کے لیے انگریزی اصطلاحات کا بے دریغ استعمال کیا۔ انگریزی ادب سے اپنی قربت کے اظہار کے لیے انہوں نے نہ صرف فارسی بلکہ عبرانی اور دیگر زبانوں میں مثالیں بھی پیش کی۔

مولانا حالی کے پیش نظر اردو کے شعری اور نثری ادب کی اصلاح زیادہ اہمیت رکھتی تھی۔ لہٰذا بہت خوبصورت اور گہرائی ہونے کے باوجود انہوں نے اردو شاعری کو قابل اصلاح قرار دیا ہے۔

امداد امام اثر:

اردو ادب میں جن چار شخصیات کو ادبی تنقید کے آغاز کا سہرا جاتا ہے ان میں سے بڑا نام شمس العماء نواب سید امام اثر کا بھی ہے۔ ناقد ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک پائے کے شاعر بھی تھے۔ ان کا دیوان شعر دیوان امام اثر کی دفاع اشاعت کے مرحلے سے گزر چکا ہے۔

ان کی تنقیدی و تقابلی ادب پر مبنی تصنیف دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں انہوں نے زبان پر بحث کی اور دنیا میں پائی جانے والی معروف زبانوں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور جگہ جگہ تقابل اور درجہ بندی بھی کی ہے۔

ان کی تنقید کی دوسری جلد پہلی تنقید پر مشتمل ہے جس میں انہوں نے ولی اور غالب کی غزل مرثیے اور قصیدے پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ امداد امام اثر ایک وسیع المطالعہ شخص تھے۔ انگریزی زبان اور یورپ

کی دیگر زبانوں پر انہیں خاصی قدرت حاصل تھی۔ انہوں نے زبان و ادب کے تقابل میں حوالہ ضرور بنایا مگر وہ مغرب سے متاثر نہیں ہوئے۔ جبکہ ان سے قبل مولانا حالی اپنی تنقید و تقابل میں یہ جوہر پیدا نہ کر سکے۔

اردو تنقید میں امداد امام اثر خاص اہمیت کے حامل ہیں۔ تنقید میں اگرچہ ان پر کم توجہ دی گئی لیکن ان کے تنقیدی کارنامے دیگر نقادوں سے کسی طور کم نہیں۔ جس وقت مقدمہ شعر و شاعری کی شہرت عام تھی اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ مقدمہ شعر شاعری پر جن امور پر بحث کی گئی وہ اتنے اہم اور ہمہ گیر تھے کہ امام اثر اور شبلی کو انہیں اپنی بحثوں کا موضوع بنانا پڑا لیکن ہر دو نقادوں نے اپنی بحث کے دوران ان کا نام لینے سے گریز کیا۔

امداد اثر کے ہاں شاعری کا رتبہ بہت بلند ہے وہ شعر و شاعری کو مصوری اور موسیقی کی طرح سمجھتے ہیں ان کے خیال میں جو شاعر اور ادیب شاعری کا صحیح ذوق رکھتے ہیں۔ شاعری ان کی اندرونی اندیشوں کو ختم کر دیتی ہے۔ اثر حالی کی مانند اخلاق و کردار کو شاعری کے لیے لازمی قرار دیتے ہیں ان کے مطابق شاعری اخلاق پر اثر انداز ہوتی ہے اور شاعری کا اثر یورپ معاشرے پر ہوتا ہے۔ وہ موسیقی کو بھی شاعری کے ساتھ جوڑتے ہیں ان کے خیال میں موسیقی ایک اچھی اور تاثیر چیز ہے وہ افلاطون کے اس خیال کی نفی کرتے ہیں کہ موسیقی معاشرے میں بگاڑ کا سبب بنتی ہے۔ بلکہ ان کے خیال کے مطابق موسیقی جذبوں کی پاکیزگی اور تطہیر کے لیے ضروری ہے۔ مولانا حالی نے اپنی کتاب میں فطرت کے لیے اکثر و بیشتر نیچر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ امام اثر نے بھی ان کی تقلید میں نیچر یا نیچرل کے استعمال کیا ہے۔ لیکن عموماً وہ نیچر یا نیچرل کے استعمال کی نسبت فطرت کے استعمال پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔

مولانا شبلی نعمانی مسلمانان برصغیر کے نہایت پر آشوب دور میں پیدا ہوئے ان کی پیدائش ۳جون ۱۸۵۷ء اعظم گڑھ میں ہوئی جو موجودہ ریاست اتر پردیش کا اہم ترین شہر ہے۔ وہ اردو میں اپنی جمالیاتی تنقید اور سیرت النبیٰ ﷺ پر سیر حاصل کتاب لکھنے کی وجہ سے عام شہرت رکھتے ہیں۔ شبلی عربی، فارسی، ترکی اور اردو کے بے بدل عالم تھے وہ شاعری بھی کرتے تھے لیکن ان کی شہرت عام سیرت النبیٰ ﷺ اور تقابل ادب کے حوالے سے ہے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں انہوں نے سیرت النبیٰ ﷺ کو مکمل کرنے کا کام سید

سیلمان ندوی کے سپرد کیا۔ انہوں نے سیرت النبیٰ ﷺ کی پہلی چار جلدیں خود لکھیں بقیہ پانچ جلدیں سید سیلمان ندوی نے اتنی عرق ریزی اور کمال سے مکمل کیں کہ کہیں شائبہ نہیں گزرتا کہ شبلی کی تحریر کہاں اختتام پذیر ہوئی اور سلیمان ندوی نے کہاں سے آغاز کیا۔

سر سید احمد خان ان سے عمر اور درجے میں بڑے تھے لہذا جب وہ بین شعور تک پہنچے تو انہوں نے لا محالہ مسلمانان برصغیر کو ذلت آمیز زندگی سے نجات دلانے کے لیے سر سید کی فکر اور کوششوں سے مکمل اتفاق کیا۔ سر سید احمد کان رسالہ تہذیب الاخلاق میں اردو کی پرانی روش اور بے مقصد سخن گوئی پر پہلے ہی قلم اٹھا چکے تھے۔ شبلی نعمانی بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کو فخر سمجھا۔ یوں تو المامون، سیرت النبیٰ ﷺ اور بہت سی دیگر نگارشات نے اپنے تنقیدی جوہر کا مظاہرہ کر چکے تھے تاہم حالی مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر ان سے آگے بڑھ گئے۔ حالی کی مقدمہ شعر و شاعری کو ایک مختصر تصنیف ہے لیکن اس میں فن شعر و شاعری کی جن باریکیوں پر تنقید کی گئی ہے اس یں تنقید اور تقابل ادب کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دینے والوں کے لیے مشعل راہ کا کام کیا۔

موازنہ انیس و دبیر دو وجوہات کی بنا پر تنقید کے اہم پیرائے سے مختلف ہے اولاً یہ کہ اس میں تنقید کے جمالیاتی پہلو کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ ثانیاً شبلی نے موازنہ کرتے وقت انیس / دبیر سے برتر ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ انیس کے حق میں موازنہ کرتے وقت ڈنڈی مارنے کا یہ فعل تنقید شبلی کے روشن رخ کو گہنا دیتا ہے۔

مہدی افادی:

مہدی افادی اردو کے صاحب طرز انشاء پرداز تھے۔ وہ شبلی کے اسلوب اور فکر سے متاثر تھے لیکن کچھ شبلی کچھ ان کے اسلوب نگارش کی تحسین خود مولانا شبلی بھی کرتے تھے۔ مہدی افادی نے زیادہ نہیں لکھا لیکن ان کا مختصر لکھنا بھی ان کو صفحہ اول کے نثر نویسوں میں جگہ دلانے کے لیے بہت تھا۔ ان کے مضامین اور خطوط اعلیٰ ترین اور مرصع نثر کے حامل ہیں۔ مضامین کے علاوہ ان کے خطوط کے دو مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

مجموعی جائزہ:

فرانسز بیکن اپنے وقت کا نہایت عقل مند شخص تھا۔ اس کے مضامین دنیاوی فلاسفی کا ایک خزینہ موجود ہے۔ اس کے مضامین میں ان دنیاوی اصولوں کا ایک مجموعہ ہے جس کا جاننا اور اسی کے مطابق زندگی گزارنا زندگی آسان بنانے کے لیے ایک لازمی شرط ہے۔ بیکن نے اپنے مضامین میں موازنہ کرتے وقت کسی بھی فعل یا زندگی کے کسی پہلو سے متعلق بات کرتے ہوئے اس کے اچھے اور برے دونوں پہلوؤں کو مد نظر رکھا اور اسی کے مطابق لوگوں کو سمجھانے کی بجائے ایک راستہ دکھانے کی کوشش کی۔ اس کا مطمع نظر یہ ہے کہ لوگوں کو دلیل کے ساتھ ہر پہلو سے متعلق آگہی دی جائے اور نظریہ پیش کرنے کی بجائے عمل کا اختیار قاری کے ہاتھ میں دیا جائے۔ جب بیکن کسی شخص کو قائل کرتا ہے تو اس کے پیش روؤں سے متعلق اس کو آگاہ کر دیتا ہے اور اس کے ممکنہ اچھے یا برے رد عمل سے بھی آگہی فراہم کرتا ہے۔ اپنے مضمون Of Great Place میں وہ بیان کرتا ہے کہ کس طرح ایک اچھی پوزیشن انسانی زندگی کو متاثر کرتی ہے۔ لیکن دلیل پیش کرتا ہے کہ اس قسم کے لوگ شاید ہی کبھی افسردہ ہوں گے کیونکہ انھوں نے پہلے ہی اپنی زندگی میں موجود مقاصد کو حاصل کر لیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عظیم لوگ ہمیشہ اپنی ناکامیوں پیچھے موجود عناصر کو تلاش کرنے میں مصروف ہوتے ہیں۔

اپنے مضمون Justification for Love میں بیکن اس بات پر زور دیتا ہے کہ اچھے کام اور معیار کا خیال آدمی کے اندر تحریک کو ختم کر دیتا ہے اور ہم ان کی بات سے متفق ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جب بیکن اس مدعا کو بیان کرنے کے لیے دلائل پیش کرتا ہے۔ بیکن کہتا ہے کہ challenge کو قبول کرنے سے پہلے اس کے اچھے برے رد عمل اور وجوہات کا تفصیل میں جامع انداز میں جاننا ضروری ہے۔

بیکن کے مطابق زندگی میں موجود مشکلات کسی عہدے یا پوزیشن کے ہونے کی صورت میں ختم ہو سکتی ہیں یا کسی بھی انسان کے لیے ان پر قابو پانے میں آسانی رہتی ہے۔ کیونکہ دنیاوی اصول یہی ہے کہ طاقت اور عہدہ ہی انسان کے لیے مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے۔

Of Superstitions بیکن کا ایسا مضمون ہے جس میں بیکن نے مافوق الفطرت چیزوں پر اعتقاد رکھنے اور مذہب کے معاملے میں بدعقیدت ہونے کی شدید مزمت کی ہے۔ بیکن کا دور انگلینڈ میں معاشی ترقی کا ابتدائی دور تھا۔ صنعتی انقلاب آہستہ آہستہ انگلستان سمیت دیگر یورپی ممالک میں جڑ پکڑ رہا تھا۔ ایسے میں سائنسی طرز فکر اپنانے والوں کی تعداد اور مذہب کے مقابلے میں عقلی طرز فکر اپنانے کی حوصلہ افزائی ہو رہی تھی۔ ایسے میں مذہب کے وہ تاریک گوشے جنھوں نے ایک لمبے عرصے تک یورپ کو تاریک دور میں داخل رکھا۔ ان گوشوں سے پردے اٹھتے جا رہے تھے۔ مذہب کے معاملے میں لوگوں کو بے وقوف بنانے اور انہیں ناخواندہ رکھنے کی پوری پالیسی میں فرق آچکا تھا۔ میں اس مدعے پر بات کرنے والے لوگوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ بیکن نے اپنے مضمون میں انتہائی منضبط انداز میں بدعقیدت ہونے اور مذہب کی اصل تعلیمات کے بجائے توہم پرستی پر انتہائی سائنسی انداز میں مدلل بحث کی ہے۔

بیکن کا مضمون Of Ambition انسانی فطرت اور ریاست کے معاملات کے بارے میں بیکن کے گہرے علم اور فہم کا آئینہ دار ہے۔ ان کے مطابق کسی عہدے، چیز یا شہرت کا حصول جس میں جذبے کی انتہائی شدت شامل ہو، کسی انسان کو غیر متحرک رکھنے کی بجائے متحرک اور ہر دم عمل پر آمادہ رکھنے میں اپنا پورا کردار ادا کرتا ہے۔ اس کے مطابق یہ جذبہ اس قدر شدید ہوتا ہے کہ اس کی وجہ سے کوئی شخص ناکام ہونے کی صورت میں کمینگی اور پن کے مظاہرے پر اتر سکتا ہے۔ بیکن بادشاہوں کو اس بات کا مشورہ دیتا ہے کہ ایسے بلند ارادہ اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے کچھ بھی کر گزرنے والے لوگوں کو ملازمت دینے سے گریز کیا جائے کیونکہ ان کے ساتھ نمٹنا بادشاہوں کے لیے مستقل دردسر کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔

مضمون Of Innovation میں بیکن کہتا ہے کہ اختراعات اور ایجادات لوگوں کے لیے مفید ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن انسان ان ایجادات کو خوشی سے قبول نہیں کرتا۔ بیکن کے مطابق انسان بنیادی طور پر روایت پسند واقع ہوا ہے۔ وہ قدامت پسندی کی وجہ سے اپنے رسوم ورواج اور عادات کو اپنائے رکھنے میں خوشی محسوس کرتا ہے۔ انسان علاوہ ازیں برے ارادوں اور عقائد کی طرف بھی فطری طور پر مائل ہو جس کی وجہ سے برائی انسان کی طرف بہت تیزی سے بڑھتی چلی آتی ہے اور جب تک اس کا قبضہ انسان کے ذہن ودل پر

ہوتا ہے اس کے اعمال کو بہت بری طرح سے پوری طاقت کے ساتھ خراب کرتی ہے۔ بیکن کہتا ہے کہ اچھائی انسان میں برائی کی مانند چھپی ہوئی نہیں ہوتی اور نہ ہی خود بخود پیدا ہوتی ہے بلکہ اسے اپنی ذات پر ٹھونسنا پڑتا ہے۔ بیکن کے مطابق ایجادات بری نہیں بلکہ انسان اپنی بری فطرت کی وجہ سے اس کو بدترین طریقے سے استعمال میں لاتا ہے۔ اس کے مطابق کہ اگر ہر ایجاد بری ہے تو علاج اور دوا کے نئے طریقے بھی ایجادات ہیں اور انسان اگر ان ایجادات سے منہ موڑ لے گا تو اپنے آپ کو مصیبت میں مبتلا کرنے والی بات ہے۔ اگرچہ یہ نئی چیزیں انسان کی زیادہ مددگار اور فائدہ مند ہیں مگر پھر بھی شروع میں یہ مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ پرانی چیزوں اور روایات سے میل نہیں کھاتے۔ ایجادات تو ان اجنبیوں کی طرح ہے جنہیں بقول بیکن کے:

ہم ان کی تعریف تو کرتے ہیں مگر ان کو اپنانے سے کتراتے ہیں۔

بیکن کہتا ہے وقت بڑی بڑی تبدیلیاں لاتا ہے۔ مگر یہ تبدیلیاد دھیرے دھیرے اور خاموشی کے ساتھ رونما ہوتی ہیں۔ اس لیے وقت کی لائی ہوئی تبدیلیوں سے ہمارا نظام درہم برہم نہیں ہوتا۔ کیا ہی بہتر ہوتا کہ اگر انسان بھی اسی معاملے میں وقت کی پیروی کرتا اور سوچ کے ساتھ نئی چیزیں ایجاد کرتا ہے۔

بیکن کے مطابق انسان کا فطری رجحان اپنے نظریات کی نشوونما ہے۔ انسان کی بات چیت اس کے علم اور اس کے طرز استدلال پر مبنی ہوتی ہے۔ لیکن انسان نہ تو فطرتاً طاقت ور ہے اور نہ ہی اس کی باتیں اتنی قوی ہیں۔ انسان بنیادی طور پر روایات اور اصولوں کا پابند ہے۔ اس لیے اس کی باتوں اور اس کے عمل میں اکثر اوقات بہت تضاد پایا جاتا ہے۔ بیکن کہتا ہے کہ انسانی معاشروں میں رسوم ورواج بہت طاقتور ہیں اور یہ طاقتور اتنے زیادہ ہیں کہ اچھے خاصے باشعور انسان کو قصائی بنا دیتے ہیں۔ کوئی شخص کسی کام کو سرانجام دینے کے لیے لمبی چوڑی باتیں تو کر سکتا ہے مگر وہ دراصل اپنی رسوم ورواج کا غلام رہتا ہے اور ان کی قید سے چھٹکارہ نہیں پا سکتا۔

مضمون نگار فرانسز بیکن نے اس ضمن میں بھارتی مذہبی جنونیوں کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ مذہبی جنونی خود کو زندہ چلا کر اپنی جان قربان کر دیتے ہیں۔ ان کی بیویاں بھی شوہر کی لاش کے ساتھ ہی خود کو بھسم کر دیتی ہیں۔ یونانی دیومالا میں سے مثال دیتے ہوئے بیکن کہتا ہے کہ قدیم سپارٹا میں لوگ چاند کی دیوی ڈیانا کی

قربان گاہ پر کسی ہچکچاہٹ کے بغیر خود کو شدید قسم کی ایذائیں دیا کرتے تھے۔ یہی صورتحال روسی عیسائی راہبوں کی تھی جو کھلے آسمانوں تلے ٹھنڈے پانی کے ٹب میں بیٹھ جاتے اور رات کی شدید سردی سے جم کر مر جاتے ہیں۔ بیکن کا ماننا ہے کہ چونکہ رسمیں ہی انسان کی پوری زندگی کو کنٹرول کرتی ہیں۔ اسی سبب انسان کو بد رسومات سے چھٹکارا پا کر اچھی رسومات اختیار کرنی چاہیے تاکہ ہماری زندگی آسان اور سادہ ہو سکے۔ بیکن کے مطابق رسمیں اتنی طاقتور ہوتی ہیں کہ ہمارے جسم کے اعضا بھی ان کی پیروی کرتے ہیں۔ کیونکہ انسان دوسروں کی نقل کرتے ہوئے ہی دراصل ایک رسم ہی پوری کر رہا ہوتا ہے اور اس میں وہ دوسرے شخص سے بہتر کارکردگی دکھانے کا سوچتا ہے۔ ایسی صورتحال میں رسم کی طاقت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جاتی ہے۔ آخر میں بیکن کا کہنا یہ ہے کہ دولت مشترکہ میں شامل ممالک اور حکومتیں اچھی عادات و رسوم کو رواج دیتی ہیں لیکن وہ بچوں کی عادات کی اصلاح کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔

بیکن اپنے مضمون Of Enmy میں محبت اور رشک و حسد کو سب سے زیادہ طاقتور جذبہ قرار دیتا ہے۔ اس کی مطابق یہ دونوں جذبے انسانی ذہن پر اس قدر چھائے رہتے ہیں کہ بے قابو خواہشات پیدا کرتے ہیں۔ ان دونوں میں سے بیکن رشک و حسد کو ایک منفی جذبہ قرار دیتا ہے۔ حسد کا عمل کافی لوگوں کی باتوں اور ان کی آنکھوں سے خارج ہونے والی چمک میں دیکھا جا سکتا ہے۔ بیکن کے مطابق وہ لوگ جو کسی خاص خوبی کے مالک نہیں ہوتے وہی زیادہ تر دوسرے لوگوں سے حسد کرتے ہیں۔ بیکن یہ کہتا ہے کہ متجسس اور ٹوہ میں لگے رہنے والے تمام لوگ بد فطرت ہوتے ہیں۔ بیکن کہتا ہے کہ اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھنے والے لوگ حاسد ہوتے ہیں۔ خاص طور پر ان کا یہ جذبہ اس وقت سامنے آتا ہے جب وہ نسبتاً کم تر درجے کے لوگوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتا دیکھتے ہیں۔ بد شکل و معذور افراد، خواجہ سرا، بوڑھے افراد اور ناجائز اولاد اکثر دوسروں سے رشک و حسد کرتے ہیں۔ بیکن کا ماننا ہے کہ وہ شخص جو اپنی خامی کو درست کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا وہ ہمیشہ دوسروں کو نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچتا ہے۔ مختلف عبادات کے لوگ جب کسی خاص شعبے میں یک جان ہو کر ایک جیسی کارکردگی کے حامل نہیں ہوتے تو دوسرے لوگوں سے حسد کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ لوگ سب سے زیادہ حسد ان سے کرتے ہیں جو اپنی دولت اور خوشحالی کی نمائش کرتے ہیں جبکہ سادہ مزاج اور

عاجز فطرت لوگوں سے سب سے کم حسد کیا جاتا ہے۔ ایسے لوگ جو اپنی خاص خوبیوں یا امتیاز کی وجہ سے پہلے ہی اچھے عہدوں پر کام کرتے ہیں لوگ ان سے بہت کم حسد کرتے ہیں کیونکہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ ان کا حق ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جو بہت تکالیف اور مشکلات اور خود کو خطرات میں دھکیلنے کے بعد اعلیٰ عہدوں پر تفویض ہوتے ہیں ان سے بھی دوسرے لوگ حسد کرتے ہیں۔ بیکن کہتا ہے کہ حسد اور رشک کا جذبہ کسی انسان میں ہر وقت سرگرم عمل رہتا ہے اور اس کی کبھی کوئی چھٹی نہیں ہوتی۔ یہ جذبہ اور احساس بقیہ دیگر جذبوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ غیر اخلاقی ہوتا ہے۔

بیکن اپنے مضمون Of Custom and Education میں انسان کے رجحانات اور نظریات کے بارے میں بات کرتا ہے۔ اس کے مطابق انسان کی بات چیت اس کے علم اور آرا پر مبنی ہوتی ہے۔ لیکن وہ علم کے مطابق عملی نہیں کرتا بلکہ عمل میں رسوم ورواج کو ہی مد نظر رکھتا ہے۔ بیکن کے مطابق انسان کی فطرت اور خیالات کے مقابلے میں انسان کا معاشرے کے رسوم ورواج کی گرفت کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ توہمات سے بھی انسانی معاشرے میں نہایت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ بیکن کہتا ہے کہ بعض مذہبی حقائق اس قدر طاقتور ہوتے ہیں کہ اچھے خاصے فہم رکھنے والے باشعور شخص کی عقل کو ساقط کر کے اسے پیشہ ور قصائی میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ بیکن کے مطابق کوئی شخص کسی کام کو انجام دینے کے لیے لمبے چوڑے دعوے تو کر سکتا ہے مگر دراصل وہ رسوم ورواج کا غلام ہوتا ہے اور ان کی قید سے رہائی نہیں پا سکتا۔ مضمون میں مثالیں دیتے ہوئے بیکن کہتا ہے کہ بھارت کے مذہبی جنونی خود کو زندہ جلا کر اپنی جان قربان کر دیتے ہیں۔ ان کی بیویاں بھی شوہر کی لاش کے ساتھ زندہ جل مرتی ہیں۔

یونانی دیومالا سے مثال دیتے ہوئے بیکن کا کہنا ہے کہ قدیم سپارٹا کے لوگ بھی چاند کی دیوی ڈیانا کی قربان گاہ پر بغیر کسی ہچکچاہٹ کے خود کو شدید قسم کی تکلیفیں دیا کرتے تھے۔ اسی طرح روس میں بعض راہب کھلے آسمان تلے ٹھنڈے پانی کے تالاب میں بیٹھ جاتے اور رات کی شدید سردی سے جم کر مر جاتے۔ بیکن کہتا ہے چونکہ رسمیں ہی انسان کی پوری زندگی کو کنٹرول کرتی ہیں۔ اس لیے انسان کو اچھی رسمیں اختیار کرنی چاہیں۔ ہمیں اپنی زندگی کے آغاز ہی مختلف رسموں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بچپن کی ایک رسم تعلیم ہے اور یہ

انسانی زندگی کی سب سے بڑی رسم ہے۔ بیکن کے مطابق بعض رسمیں اس قدر طاقت ور ہیں کہ ہمارے جسم کے اعضا بھی ان کی پیروی کرتے ہیں۔ بیکن مزید کہتا ہے کہ اگرچہ دولت مشترکہ میں شامل ممالک اور حکومتیں اچھی عادات ورسوم کو رواج دیتی ہیں لیکن بچوں کو عادات کی اصلاح کرنے کی کوشش ان ممالک کے پیش نظر نہیں۔

مضمون Of Studies بیکن کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے مضامین میں سے ایک تھا۔ یہ انتہائی جامع اور خوبصورت انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس کا انداز اتنا جامع ہے کہ اس میں موجود مواد کسی عام مصنف کے لیے لکھنا انتہائی مشکل تھا۔ بیکن کے مطابق ہم مطالعہ مسرت کے حصول، دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے یا کسی کام کے منظم انداز میں کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ بیکن کے مطابق مطالعہ نہ صرف حصول مسرت کے لیے ضروری ہے بلکہ یہ انسان کو بہترین صورت میں ڈھالنے اور کارآمد بنانے کے لیے بھی لازم ہے۔ بیکن کو بہت زیادہ مطالعہ کرنا بھی پسند نہیں کیونکہ اس کا تجزیہ یہ بتاتا ہے کہ حد سے زیادہ مطالعہ کرنے والے لوگ سست اور نکمے ہو جاتے ہیں۔ بیکن کہتا ہے کہ مطالعے سے گریز کرنے والے لوگ مکار اور چال باز ہوتے ہیں کیونکہ وہ مطالعے کو کار بے مصرف سمجھتے ہیں۔ دانش مند لوگ مطالعے کے ذریعے حاصل کردہ علم کو دنیاوی کاموں میں استعمال کرتے ہیں۔ علم کی افادیت سمجھتے ہوئے بیکن کا مشورہ کہ تھیوری کا اصل کام اس کو عمل میں لانا جو کتابی علم سے بہت بہتر ہے۔ بیکن مشورہ دیتا ہے کہ کتاب پڑھتے ہوئے مصنف کے نظریات رد کرنے چاہیں اور نہ ہی تصنیف میں لکھی ہوئی باتوں کو آسمانی صحیفہ سمجھ کر قبول کرنا چاہیے بلکہ غیر جانب دار رہتے ہوئے اپنی سمجھ بوجھ سے کام لینا چاہیے۔ کتابوں کی قسمیں گنواتے ہوئے بیکن نے مذکورہ مضمون میں کہا ہے کہ کچھ کتابوں کو نسبتاً کم شوق سے پڑھا جاتا ہے جبکہ بعض دیگر کتب کو پوری توجہ اور انہماک سے پڑھی جاتی ہیں تو ان میں درج شدہ امور کو اچھی طرح محفوظ کیا جانا چاہیے۔ بیکن کے مطابق مطالعہ انسانی علم میں اضافہ کرتا ہے جبکہ گفتگو انسانی عقل اور سمجھ بوجھ کو بہتر کرتی ہے۔ تحریر کرنے سے کوئی بھی شخص مکمل انسان بن جاتا ہے۔ مذکورہ مضمون میں بیکن نے مختلف شعبوں پر اپنی رائے دیتے ہوئے کہا ہے کہ تاریخ کا مطالعہ انسان کو عقل مند اور شاعری تخیل پسندی بناتی ہے۔ ریاضی ہوشیار بناتی اور کم عقل لوگوں کے لیی بھی مفید ہے۔

فزکس کمسٹری میکانیات اور سائنسی علوم انسان میں غور و فکر اور تدبر کی عادت پیدا کرتے ہیں۔ مطالعہ خلاقیات انسان کو زندگی میں سنجیدہ بنا دیتی ہیں۔ منطق کے مطالعے سے ایک شخص دوسروں سے اپنی رائے منوا سکتا ہے۔ بیکن کے مطابق مطالعہ انسان کی ذہنی بیماریوں کا علاج بھی ہے۔ بالکل اسی طرح سے جس طرح جسمانی ورزش بدنی نقائص کو دور کرتی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ احمد دہلوی، سید، مولوی، فرہنگ آصفیہ، مرتبہ، اردو سائنس اکیڈمی بورڈ، اپر مال، روڈ، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص۳۶۵

۲۔ وارث سرہندی، علمی اردو لغت (جامع)، علمی کتاب خانہ کبیر سٹریٹ، اردو بازار، لاہور، ۱۹۹۶ء، ص۱۳۹۷

3. John Shakepear, John Shakespeer's Dictionary, Sang-e-Meel Publicaitons, Chowk Urdu Bazaar, PO Box 997, Lahore, 1996, P. 1638

۴۔ شان الحق حقی، فرہنگ تلفظ، مقتدرہ قومی زبان، طبع اول، ۱۹۹۰ء، ص۸۷۶

۵۔ وارث سرہندی، قاموسِ مترادفات، اردو سائنس بورڈ، لاہور، طبع اول، ۱۹۸۶ء

6. A. C. Benson, The Art of an essayist Key to good living submitted on May 1, 2011, Vol. 5, P. 123

7. Encyclopedia of America Vo. 15, P. 233

8. Encyclopedia Ankarta, Vol. 3, P. 160

۹۔ سید عبد اللہ، ڈاکٹر، اشارات تنقید، مکتبہ خیابان ادب لاہور، ۱۹۶۶ء، ص۳۴۴

۱۰۔ حسرت کاسگنجوی، ڈاکٹر، ادب علمی اور فکری زاویے، نفیس اکیڈمی، اردو بازار، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص۴۹

۱۱۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، انشائیہ کی بنیاد، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۶ء، ص۶۴

۱۲۔ سر سید احمد خان، عضا میں سر سید، منتخیات تہذیب الاخلاق، مرتب: ڈاکٹر غلام حسین، مکتبہ خیابان ادب، لاہور، ۱۹۶۷، ص ۱۰

۱۳۔ گارساں وتاسی، بحوالہ ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، محمد عتیق صدیقی، علی گڑھ، انجمن ترقی اردو ہند دسمبر ۱۹۵۷ء، بار اول، ص ۳۲۹

۱۴۔ بشیر سیفی، ڈاکٹر، اردو میں انشائیہ نگاری، نذیر پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۳۶

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۷

۱۶۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر، اصناف ادب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۱۴۴

۱۷۔ سیدہ جعفر، ڈاکٹر، ماسٹر رام چندر اور اردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ، اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، حیدر آباد، دکن، طبع اول، ۱۹۶۰ء، ص ۴۹

۱۸۔ Sussan Bassnett, Comparative Literature Crtitical Introduction, Black Well Publishers 108, Kowly Road, Oxford OX-4 1 JF UK, P. 11

۱۹۔ الطاف حسین حالی، "مقدمہ شعر و شاعری"، ۱۹۸۷ء، ص ۱۲۶

۲۰۔ سکسینہ، رام بابو، تاریخ ادب اردو، جلد اول، علمی بک ہاؤس اردو بازار، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۷

۲۱۔ محمد حسین آزاد، "آبِ حیات"، ھجرا انٹر نیشنل پبلیکیشنز، لاہور، س سن، ص ۲۸۔۲۷

۲۲۔ انور سدید، ڈاکٹر، "اردو ادب کی تحریکیں"، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص ۳۶۴

باب دوم:

سر سید احمد خان ایک تعارف

الف) تعارف:

یہ بات پورے یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں انسانیت کی تاریخی حیثیت نے ایک نئی سمت رخ اختیار کر لی جس میں معاشرہ اور انسان دونوں ہی مشکلات کے ایک دھانے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ جنہیں مختلف پہلوؤں پر دیکھا جاسکتا ہے۔

بیسویں صدی کے وسط تک پوری دنیا ایک ایسی قوت کے زیر اثر آچکی تھی جسے ہم سامراج کہہ سکتے ہیں۔ اور دوسرے نصف تک تقریباً تمام دنیا کے ممالک اس سامراج کے خلاف یہ جنگ جیت کر اس کی گرفت سے آزادی حاصل کر چکے تھے۔ مگر وہاں کے اندرونی اور ذاتی مسائل و وسائل بہت زیادہ تھے جس نے وہاں کے معاشرے کو جکڑ رکھا تھا لیکن بہت حد تک اپنی حالت پر سنبھل کر اپنے سماجی اور معاشرتی ماحول کی تشکیل علوم کے ذریعے کرنے کی کوشش کی، جن میں خاص طور پر سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے در وا ہوئے۔ اپنی عقل و ہنر مندی کی بدولت انسان نے قدرت کی تسخیر جیسا اعلیٰ کارنامہ بھی انجام دیا۔ توہم پرستی سے آزاد ہوا اپنے شعور کو معاشرتی تبدیلیوں سے ہمکنار کرنے پر آمادہ کیا اور قدرت کے قانون (Might is Right) کو رد کیا اور خود اپنی ذاتی کوششوں کے لیے ایک نئی راہ متعین کی۔

ہم جس صدی میں سانس لے رہے ہیں وہ ادبی اور اکثر و بیشتر سیاسی و تاریخی زمانوں سے مطابقت نہیں رکھتی۔ یہ بات ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ انیسویں صدی ۱۹۰۱ء سے شروع نہیں ہوئی بلکہ اس کا آغاز وارتقاء ۱۸۸۰ء میں ہی ہو چکا تھا جب انگریزی زبان کے ادیبوں نے اپنا پنجہ ادب کی دنیا میں گاڑھا جس میں کائسٹرڈ، جیمز جوائس اور جارج برنارڈ کا نام سر فہرست ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ برصغیر میں اس کا آغاز سر سید،

حالی اور آزاد سے ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں وکٹوریہ دور حکومت میں شیلے، کٹیس اور وبائرن نے اپنا نام پیدا کیا اور رومانوی طرز انداز کو ایک نئی راہ دکھائی لیکن ایک بات روز روشن کی عیاں ہے کہ ادبی صدیاں ہمیشہ ہی تاریخی صدیوں سے ۲۰ یا ۲۵ سال جدید رہی ہیں۔ تاریخی تبدیلی، سیاسی و معاشرتی ردوبدل ادب میں ہمیشہ ایک سا رہتا ہے۔ وہ نہیں بدلتا کیونکہ ادب کا تعین تاریخ سے نہیں رجحانات و میلانات سے کیا جاتا ہے۔ ادب کسی بھی پلاننگ کے تحت وقوع پذیر نہیں ہوتا اور نہ ہی اس کی آمد کا کوئی سامان مقرر کیا جاتا ہے۔ حالی مقدمہ شعر وشاعری ایک حد تک بوطیقا سے مماثل ہے، جس نے ایک لمبا عرصہ ہمارے ساتھ گزارا لیکن بڑی حد تک ہمیں گمراہ بھی کیا۔

سرسید کے علمی و عملی شعور دیکھ کر ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے مضمون "سرسید کا اثر ادبیات اردو پر" میں کچھ یوں قلمبند کرتے ہیں:

> سرسید نے اردو ادب کو جو ذہن دیا اس کے عناصر ترکیبی کی جائے تو اس بڑے بڑے عنوان ہوں گے۔ مادیت، عقلیت، اجتماعیت اور حقائق نگاری سرسید کے مجموعی فکر و ادب کی عمارت اپنی بنیادوں پر قائم ہے۔ اور شاید یہی وہ نمایاں اور اہم رجحانات ہیں جو اردو ادبیات میں سرسید کا فیض خاص سمجھے جاتے ہیں۔ ان رُجحانات سے اردو کا سارا ادب متاثر ہوا۔[1]

برصغیر کی تاریخ کے کچھ اوراق پلٹے جائیں تو کچھ ایسی ہی شخصیات کا ذکر بھی ملتا ہے جو اردو ادب کے فروغ کے بہت بڑے بڑے ذخائر چھوڑ گئے۔ اسی ضمن میں بہت سی اصناف بھی سامنے آئیں جو مقامی لوگوں میں شعور بیدار کرنے کے لیے بہت بڑی تاریخ رقم کر گئے۔ ان میں بہت سی انواع و اقسام جو ادب سے تعلق رکھتی ہیں انہوں نے اپنی تحریروں سے لوگوں کو ان کے مقاصد حاصل کرنے کے لیے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ایک ایسا شخص جو بالغ النظر، ہمدرد، تاریخ دان، مترجم، مختلف النوع اداروں کا خالق، وہم و تعصبات کا دشمن، سائنس کو تحریروں میں رواج دینے والا ایک ناصح، ایک بے چین اور گہری سوچ رکھنے والا، کسی حد تک مادیت پرست، پرانی چیزوں سے عقیدت رکھنے والا شخص، دوستوں کا دوست اور دشمنوں کا دشمن اور اپنے فن

سے لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے کا ہنر رکھنے والا، محقق و نقاد، انگریزی تعلیم کو عام کرنے والا، معلم و متعلم جس کا نام سر سید احمد خان تھا۔

زندگی محدود اور مختصر ہے یہ بات میرؔ نے بھی اپنی غزل میں بیان کی ہے اور غالب نے بھی ااور تقریباً ہر شاعر نے ہی اس مضمون کو قلم بند کیا ہو گا اور جب موت واقع ہو گی تو ایسی بہت سی آرزوئیں ہمارے دل میں باقی رہ جائیں گی جن کی تکمیل کے لیے ہم نے صرف خواب سجا رکھے ہیں، غالب کی غزل جو زبان زد عام ہے اس میں سب اشعار میں زندگی کے مختصر ہونے کا ذکر ہے اور صرف ایک شعر میں جس میں انسان کو یہ پتہ چلتا ہے کہ جب اسے معلوم ہو گا کہ یہ دنیا اور دنیا کی زندگی اس کی لیے کتنی ہے اور کب تک ہے جس میں خود کو بہت اعلیٰ وارفع سمجھتا ہے وہ سب اس کا وہم و خیال لگے گا حقیقت اس کے بلکل برعکس ہے کہ انسان کی ذات مکمل طور پر فنا ہونے والی ہے اور کب وہ ختم و نابود ہو جائے یہ صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہی کو معلوم ہے۔ اور رہتی سوچوں اور خواہشوں سے بات کو وسیع کرتے ہیں کہ انسان کی سوچ ہمیشہ ترقی کی طرف جاتی ہے اور زندگی میں وہ سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے جس کا اس نے بھی گمان کیا ہو اور مسلمانوں خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں سے بات شروع کریں تو ان کے خوابوں کو تعبیر کرنے کے لیے ایک ایسا شخص جس کا نام سر سید احمد خان ہے معمور کیا گیا جس نے اپنی تمام زندگی اس مادی دنیا کے مکینوں کو دنیا و آخرت میں جینے کے ڈھنگ سکھانے میں بسر کر دی۔

جہاں تک بات کسی بھی شخصیت کے تعارف کی کی جائے تو ابن خلدون جو کہ سر سید احمد خان سے تقریبا ۱۳۳۲ء سے ۱۴۰۶ء پانچ سو سال کا فرق بنتا ہے لیکن بصری سلاطینوں کا خیال ہے کہ ان دونوں کہ بیک وقت یاد کیا جائے۔ کیونکہ دونوں نے ہی بہت ثقیل و کٹھن مرحلے گزارے اور اپنی قوم کو ایک نئی راہ پر گامزن کیا اور وہ دونوں اپنی قوم کے لیے ایسا مینارہ نور تھے جس کی روشنی نے رہتی دنیا تک سب کو روشن رکھا اور آج صدیوں بعد بھی اسی کی کرنیں سمیٹ رہی ہے۔ سر سید احمد خان روایتی شخص نہیں کہ ان کی زندگی کو روایت اور جذبات و تاثرات کے مضامین کے گرد گھمایا جائے۔ قوم جب غلامی کے اندھیروں میں گھر چکی تھی تو سر سید نے ہی قدم بڑھایا اور انہیں رہنمائی کی قندیل دکھائی جس کی لو سے انہیں منزل کے نشاں نظر

آئے۔ انہوں نے بالکل اکیلے یکتا اس میدان میں اترنے کا فیصلہ کیا جہاں بہت سی تکالیف و مصائب ان کے آگے حائل ہوئے اور ان سب کے باوجود انہوں نے مسلمانوں کی ترقی کے لیے ان کا ساتھ دیا اور انگریزی رواج میں انگریزی کی تعلیم حاصل کر لی ان سے مقابلہ کرنے کا طریقہ سکھایا جسے جدید تعلیم بھی کہا جاتا ہے جس میں انگریزی کے علاوہ سائنس کی بھی تعلیم تھی جس کے ذریعے مسلمانوں نے دنیا میں کسی حد تک ترقی کر کے یہ ثابت کیا کہ سر سید کی سوچ واقعی میں دور اندیش تھی جسے آئینہ وقت کی ضرورت اس مشکل گھڑی میں بھی معلوم تھی اور جس نے اپنی جان کو خطروں میں ڈال کر کہ ثابت کیا کہ وہ ایک مصلح انسان ہے جو کہ مفکر و مدبر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اعلیٰ پائے کا مضمون نویس بھی ہے۔

سر سید احمد خان کی شخصیت ایک ہمہ جہت پہلوؤں سے ہم آہنگ ہے وہ بیک وقت، مذہب، تعلیم اور سیاست کے حامل انسان تھے جو کہ دنیا میں نئے علوم کے متلاشی ہیں، اور جس نے دنیا کے مسلمانوں کو جدت طرازی کا درس دے کر سب میں نئے پن کے تصور کو ابھارا جس میں سائنس اور انگریزی کے علوم شامل ہیں۔

سر سید احمد خان کی ۱۷ اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی کے ایک بہت ہی باوقار اور عالی شان گھرانے میں ولادت ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت کا مسکن بھی دہلی ہی رہا، آپ ایک پر عزم اور مستقل مزاج شخصیت کے مالک تھے اور ہمہ جہت صفات کے مالک انسان تھے۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز نائب منشی کی حیثیت سے کیا اور بالآخر جج کے اعلی عہدے تک فائز ہوئے۔ انہیں بہت سے خطابات سے بھی نوازا گیا جن میں عارف جنگ، سی ایس آئی اور جواد الدولہ وغیرہ۔ سر سید ہمیشہ اپنی قوم کے خیر خواہ کے طور پر ہی سامنے رہے۔

فروری ۱۸۸۴ء کو لاہور میں انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے منعقدہ ایک خطبہ استقبالیہ کے جوابی الفاظ میں سر سید نے کہا تھا کہ:

> "میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو مثل اپنی دو آنکھوں کے سمجھتا ہوں، اس کہنے کو بھی پسند نہیں کرتا۔ کیونکہ لوگ علی العموم یہ فرق قرار دیں گے کہ ایک کو دائیں آنکھ اور دوسرے کو بائیں آنکھ کہیں گے، مگر میں ہندو اور مسلمان دونوں کو بطور ایک آنکھ کے سمجھتا ہوں۔"[۲]

سر سید کی سب سے بڑی اور اہم صفت یہ تھی کہ وہ جیسے باہر سے نظر آتے تھے ویسے ہی وہ اندر سے بھی تھے یعنی ان کے قول و فعل میں بھی کوئی تضاد نہ تھا۔ جو بات بولتے تھے اسے کر کے بھی رہتے تھے اور پھر اس بات کو سب کے سامنے ماننے سے گریز ہر گز نہ کرتے تھے۔ وہ اپنی زندگی میں باوجود ہر مشکل کے بھی اپنے سوچ و افکار سے سر گرداں نہ ہوئے ، بلکہ اپنے افکار و خیالات پر ڈٹے رہے۔ اردو ادب کی بات اگر کی جائے تو ان کی خدمات سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ ایک گوہر نایاب کی حیثیت رکھتے ہیں، خاص کر نثر کے میدان میں انہوں نے اپنا نام و مقام سنہری حروف میں کندہ کروایا ہے۔ ان کے بھرپور جدوجہد سے اردو نثر اوج کمال تک پہنچی اور نثر میں جدت طرازی نے حقیقت کا روپ ڈھالنے میں دیر نہ کی حالانکہ نثر اس سے پہلے جدت کے تقاضوں سے ناواقف تھی لیکن پھر بھی وہ لطف و عنایت سے واقف ہوئی اور آہستہ آہستہ بلندی کی منازل تک پہنچی۔ سر سید کی نثر نے اپنے پیر ایسے پھیلائے کہ بہت سے رفیقان ادب بھی اس کا حصہ بننا باعث فخر سمجھنے لگے، اور نثر کے میدان کو مزید تنوع دیا۔

سب سے پہلے عوام کے سامنے سر سید کی کتاب "آثار الصنادید" ۱۸۴۷ء میں منظر عام پر آئی جس میں انہوں نے اپنے آبائی شہر دہلی کی پرانی عمارات، شخصیات اور مقامات کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ کیا پھر بارہ سال کے بعد انھوں نے دوسری کتاب ۱۸۵۹ء میں اسباب بغاوت سید کے نام سے شائع کی۔ اس میں انہوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے حالات و واقعات کو قلمبند کیا ہے پھر ساتھ ہی سر ولیم میور کی کتاب "دی لائف آف محمد " پر تنقید کی جو کہ حضرت محمد ﷺ کی ذات اقدس پر مشتمل تھی جس پر سر سید نے بہت اعتراض اٹھائے اور اس کے جواب میں قرآن پاک کے تفسیر لکھنا شروع کر دی وھو الہدی والفرقان کے نام سے جو کہ مکمل نہ کر سکے اور اس جہان فانی سے رخصت کا وقت آن پہنچا، ۱۸۴۹ء میں سر سید نے اہم رسالہ کا اجراء کیا جو کہ رسالہ تہذیب الاخلاق کے نام سے منظر عام پر آیا، جسے عام طور پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ Spectator اور Tatlor کو سامنے رکھ کر لکھا گیا اور بعض جگہوں پر کہا جاتا ہے کہ سر سید کے چند مضامین ان رسالوں میں چھپے مضامین کے تراجم ہیں۔ لیکن نثر کے میدان میں یہ اعلیٰ کارنامہ سر سید نے اپنی جدید اور انگریزی سوچ کے ساتھ انجام دیا جو کہ سائنس کے میدان میں بھی بہت زیادہ سود مند ثابت ہوا۔ سر سید کا

سب سے اہم مقصد لوگوں کو ایک سوچ اور فکر سے آگہی دینا تھا اور نئے علوم سے متعارف کروانا بھی۔ گو سر سید نے اس زمانے میں تو بہت مصائب و تکالیف اٹھائی لیکن کچھ عرصے بعد ان کی اس کاوش کو ہر عوام و خاص نے تسلیم کیا۔ سر سید کا اصل مقصد یہ تھا بر صغیر کے مسلمانوں اور وہ خود بھی اگر اپنی زندگی کا بغور جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی حالت تب تک بہتر نہیں ہو سکتی جب تک وہ جدید انگریزی اور سائنسی علوم سے بہرہ ور نہ ہوں۔ اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے سر سید نے علی گڑھ میں ایک سکول کا قیام کیا اور بر صغیر کے مسلمانوں کو مغربی تعلیم کی طرف مائل کیا تا کہ وہ جدید دور کے تقاضوں کو پورا کر سکیں۔ سر سید کے ساتھ پہلے تو سب مخالفین ہی نظر آئے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہی مخالفین حامی و مددگار ثابت ہوئے۔ بہت سے ایسے افراد کا ذکر بھی ملتا ہے جو مسلمانوں کے لیے صرف دنیاوی ترقی کے خواہاں نظر آئے تھے۔ سر سید نے سب سے پہلے اقوام کے نظریے کو یک سر بدل ڈالا جسے پہلے قوم، راجپوت، مغل، شیخ اور سیّد وغیرہ تھی لیکن سر سید نے ان سب کو ملا کر Nation کا نام دیا اور تمام مسلمانوں کو قومیت کے جذبات کو پروان چڑھایا۔ سر سید احمد خان نے مسلمانوں کے لیے پورے دل اور نیک نیتی سے کام کیا۔ بر صغیر سے تعلق رکھنے والے تقریباً سبھی لکھنے والوں نے اپنے جذبات و خیالات کو ان کی شان میں قلمبند کیا ہے۔

ایک جگہ سر سید خود اپنی تفسیر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> اگر زمانہ کی ضرورت مجھ کو مجبور نہ کرتی تو میں کبھی اپنے خیالات کو ظاہر نہ کرتا بلکہ لکھ کر اور لوہے کے صندوق میں بند کر کے چھوڑ جاتا اور یہ لکھ جاتا کہ جب تک ایسا زمانہ نہ آئے اس کو کوئی کھول کر نہ دیکھے اور اب بھی میں اس کو بہت کم چھپواتا اور گراں بیچتا ہوں تا کہ صرف خاص خاص لوگ اس کو دیکھ سکیں۔ سر دست عام لوگوں میں اس کا شائع ہونا اچھا نہیں۔[۳]

سر سید نے نثر کے میدان میں خاص طور پر اپنا نام ثبت کیا جو کہ واقعی میں ایک قابل ستائش بات ہے۔ سر سید نے ادب کو زندگی کے لیے ایک ڈھال بنایا اور اسے زندگی پر تجزیہ کرنے کی کوشش بھی کہا ہے سر سید کو تقریباً سبھی مصنفوں اور ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں شامل کیا ہے اور تقریباً ہر ایک کے خیال کا

یہی لب لباب ہے کہ سر سید نے اردو ادب کو زندگی کا ترجمان کہا ہے۔ کیونکہ یہ زندگی کی حقیقتوں سے آشنا اور بعض جگہوں پر بالکل اسے حقیقت ہی کہا ہے۔ نثر کے میدان میں بہت وسعت بخشی اور اس کے ساتھ ساتھ شاعری میں بھی جدت طرازی کی بھرپور کوشش کی۔ سائنسی حوالے سے اگر غور کیا جائے تو اسے تخیر و تبدل اور فکر و تخیل کی صدی کہیں تو بالکل بجا ہو گا کیونکہ یہ دور اپنے زمانے کا سب سے بہترین اثرات سموئے ہوئے تھا۔ ادب میں مقصدیت کو رواج دیا اور انگریزوں کے ہندوستان آمد پر جو تبدیلیاں ادب میں رونما ہوئیں وہ صرف ان کے ہم عصروں نے تسلیم کی بلکہ وہ سر سید کو ایسی شخصیت بنا گئیں جو دوسروں کو بغاوت پر اکساتی ہیں۔ ان کے خیالات دین اور مذہب کے بارے میں متضاد ہیں۔ اس کے خیال میں ترقی کے لیے مشرقی علم سے کنارہ کشی لازمی ہے۔ اگر سر سید کے دور کو آج کے دور سے تقابل کریں تو معلوم ہو گا کہ نو آبادیات ابھی ختم نہیں ہوئی صرف ایک انداز میں ہمارے سامنے آگئی ہے۔ اب اس نو آبادیاتی نظام کو پرکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مغرب اور مغربیت کے اثرات معاشرت کو تہذیب یافتہ خیال کرتے ہیں۔

زوال سلطنت مغلیہ ایک تاریخی واقعہ ہے لیکن اس کی اہمیت و اثرات کو ظاہر کرنے کے لیے کہنا پڑتا ہے کہ ہندوستان میں ترکی سلطنت ختم نہیں ہوئی تھی بلکہ آفتاب مشرق غروب ہو گیا تھا۔ شیرازہ اسلامی منتشر ہو گیا تھا۔ ہندوستانی دہشت و حکمت فنا ہو گئی تھی۔ مشرقی علوم و فنون غارت ہو گیا تھا۔ بلند نظری اردو ادب کا بغور جائزہ لیا جائے تو جنگ آزادی ۱۸۵۷ء کے بعد متعارف ہونے والی بیشتر انگریزی ادبی اصناف مثلاً ناول، افسانہ، نظم وغیرہ تمام کی تمام نہ صرف یہ کہ اردو میں متعارف ہوئیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس دور کی انگریزی ادبی تحریکوں کو بھی اردو ادب میں متعارف کرایا۔ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۰۰ء تک یعنی سر سید کی وفات تک اردو ادب ادب پر ان کی شخصیت کی چھاپ نظر آتی ہے۔ لیکن ان کی وفات کے ساتھ ہی ۱۹۰۱ء اپریل میں مخزن پہلے شمارے سے انگریزی ادبی تحریک رومانیت کا آغاز ہوتا ہے۔ رومانیت جن معنوں میں اردو ادب میں داخل ہوئی دراصل یہ اس کا اصل مطلب نہیں تھا۔ بلکہ یہ تحریک جذبات اور احساسات کے تحت ادبی تحریک کو متاثر کرنے کا موجب ٹھہرا۔ لیکن اردو ادب میں صرف عشق اور محبت کے قصے بیان کرنے کو ہی رومانیت سے منسوب کر دیا گیا۔

سر سید کے پیش نظر چونکہ ایک بڑا مقصد تھا لہٰذا ان کے نزدیک ادبی رویوں میں جذبات و احساسات کا کوئی دخول نہیں تھا ان کی مقصدی تحریک ان کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہو گئی لیکن اس کے اثرات اس حد تک اردو ادب پر ظاہر ہوئے کہ بیشتر متعارف ہونی والی اصناف میں اردو ادب میں مستقل حیثیت اختیار کر لی۔ سولہویں صدی کے اختتام اور سترھویں صدی کا آغاز یورپ کے معاشرے کے لیے ایک انقلابی صدی ثابت ہوئی کیونکہ صنعتی انقلاب اور سائنسی ترقی کے علاوہ عقلی بنیادوں پر جدید ریاست کے تصور نے یورپی اذہان کو مکمل طور پر تبدیل کر دیا۔ اس دور میں بیشتر انگریزی شاعر بالخصوص ورڈزورتھ جنگلات کی کٹائی نہروں کے پھیلاؤ اور صنعتی انقلاب کے نتیجے میں پیدا ہونے والی روپے پیسے کے حصول کی دوڑ اور بیگانگی کے جذبات میں اضافے کا نوحہ پڑھتے نظر آئے ہیں۔

۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپو کی شکست اور برصغیر پر تاج برطانیہ کی حکومت اپنے ساتھ نئے مسائل لے کر آئی جو اس سے قبل ہندوستان کے باسیوں کے لیے اجنبیت کے حامل تھی۔ یہ احساس شاید کم ہی رہتا لیکن بغیر کسی لڑائی کے ہندوستان کے انگریزوں کے ہاتھ میں چلے جانے یہاں کے باسیوں نے بڑی شدت سے محسوس کیا اور یوں پانچ عشرے کی مزید حکومت کے بعد انگریزوں کے خلاف ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی ہوئی۔ اس جنگ نے ہندوستان کے رہنے والوں کو بالخصوص مسلمانوں میں دو طرح کی سوچ رکھنے والی روحوں کو جنم دیا۔ پہلے گروہ کے مطابق جنگ جیتنی لازمی تھی جبکہ دوسرا جنگ کے خلاف اور مادی فوائد کے حصول کا حامل تھا۔ انگریزی کی نفسیات سے کماحقہ آگہی کئے بغیر ممکن نہ تھا۔ جنگ کے بعد چونکہ مسلمان سیاسی، سماجی اور معاشی لحاظ سے نہایت کمزور حالت میں آگئے تھے لہٰذا ان کی دفاعی حالت اکثریتی مذہب سے تعلق رکھنے والی ہندوؤں کے لیے بہت اچھی ثابت ہوئی اور انگریزی تعلیم اور زبان میں مہارت کے سبب انہوں نے انگریز سرکاری نوکریاں اور سیاسی قربت حاصل کر لی۔ سر سید احمد خان نے مسلمانوں کی اس حالت کے پیش نظر تعلیمی لحاظ سے انہیں ہندوؤں کے ہم پلہ لانے کے لیے ایک اصلاحی و تعلیمی تحریک شروع کی جو ان کی وفات تک جاری رہی۔ ادب برائے زندگی کی یہ تحریک نئے پن کے سبب کم و بیش پچاس برس بہت مقبول رہی۔ لیکن بیسویں صدی اس تحریک کے لیے موت کا پیامبر ثابت ہوئی جب مخزن کے زیر اثر انگریزی ادب سے آئی۔ انگریزی

ادب میں نئی کلاسیکیت کی تحرک کے بعد رومانیت آئی جس کے پہلے پہل شاعر ورڈزور تھ اور ایس۔ ٹی۔ کو لریج ان دونوں شعرا نے مل کر انگریزی ادب میں نئی کلاسکیت کو ختم کر دیا اور فطرت سے ہم آہنگ شاعری شروع کر دی۔ یہ اردو ادب میں کم و بیش سو برس بعد آئے۔ لیکن اردو سے متعلقہ ادیب اس تحریک کے بہت کم پہلوؤں سے واقف تھے لہٰذا انہوں نے صرف فطرت سے متعلقہ شاعری کرنے کو ہی اس تحریک کی پیروی کرنے کے مترادف سمجھا۔ انجمن پنجاب میں علامہ اقبال کی پہلی نظم جو ان کے پہلے اردو مجموعے میں شامل ہے یہ نظم ایک طرف قوم پرستی اور دوسری طرف نیچر سے متعلقہ شاعری کو ترویج دینے کے لیے پڑھی گئی۔ علامہ اقبال کے برعکس دیگر اردو شعراء کی کوششوں کے باوجود اس میدان میں ناکام ثابت ہوئے اور محمد حسین آزاد، الطاف حسین حالی جیسے شعراء نے سرسید کی مقصدی تحریک کے ساتھ جڑے رہنے میں ہی عافیت جانی۔

سرسید تحریک کے دوران متعارف شدہ اصناف کے لیے ماحول یہاں پہلے سے ہی موجود تھا۔ جیسے کہ داستان گوئی کے اختتام پر اس کی جگہ ناول نے لے لی اور ہندوستان میں صنعتی ترقی کے بعد وقت کی کمی کی شکار شہری آبادی میں افسانے کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ نظم بھی اسی طرح عام ہوئی جب شعر کہنا زیادہ عام ہوا اور لوگوں نے پرانی اصناف کی جگہ نئے سانچوں میں اظہار خیال کرنا زیادہ مناسب گردانا۔ اردو ادب پر سرسید کی خدمات سے ہم کسی صورت انکار نہیں کر سکتے۔ یہ اثرات نہ صرف اسلوب پر رونما ہوئے بلکہ موضوع اور معانی و مطالب پر بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ سرسید احمد خان کے اثرات جو کہ ادب پر اثر پذیر ہوئے ان پر بہت سی جگہوں میں بیان ہوا ہے۔ لیکن ان کے علم و فن کو فکری یا علمی لحاظ سے بہت کم بیان کیا گیا ہے۔ اکثر ہم ان کے مقام و مرتبے کا تعین کرنے کی کوشش کریں انہوں نے اردو ادب کے لیے کیا خزینہ چھوڑا یا وہ اردو ادب کے کیسے معمار تھے؟ اور وہ کون سی خصوصیات اور معیارات ہیں جو خاص کر انہی کی ذات سے وابستہ ہیں، یا وہ خصوصیات جن کو اردو ادب نے صرف انہی کے نام سے موسوم کیا یا جن کو زمانے نے اپنے سخت مزاج سے جھٹلانے اور پسپا کرنے کی کوشش کی جس کے خلاف شدید رد عمل کی ضرورت کو لازمی قرار دیا گیا۔

فنی لحاظ سے بغور جائزہ لیا جائے تو ہمیں سب سے پہلی بات جو پیش نظر ہے وہ یہ کہ تخلیقی اور علمی کوششوں میں سر سید صاحب کا کیا مقام تھا؟ کیونکہ سر سید شاعری کو ترک کر کے اردو نثر کے فروغ کے لیے کوشاں ہو گئے۔ اہل ہندوستان نے شاعری کو پیچھے کر کے نثر پر توجہ دینا شروع کیا لیکن وہ بھی تصوف، مذہب، تاریخ و فلسفہ اور تذکرہ نویسی کی حد بندیوں میں محدود رہی۔ دیگر مضامین پر طبع آزمائی کرنے والے گنتی میں شمار ہوتے تھے۔ زیادہ توجہ مذہب اور سیاست پر دی جاتی تھی۔ ہر تحریر پر تنقید و تجزیہ محبوب مشغلہ تھا۔ جہاں تک ہم اردو نثر کی بات کرتے ہیں وہ تو اپنی ابتدا و ارتقاء کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ اور اظہار رائے کے لیے نئی راہیں اور سمتیں اپنے لیے متعین کر رہی تھی۔ نثر کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عام موجودہ یا گزری ہوئی یا آئندہ آنے والی زندگی کی حقیقت آرائیوں کو اپنے الفاظ کے قالب میں ڈھال کر عام قاری کے لیے سامان بہم پہنچایا ہے۔ نیز زندگی سے جڑے مسائل اور حقیقتوں سے آگہی دے کر ان کی شناخت کرواتی ہے، نثری میدان میں غالب کے مقام کو پس پشت ڈالنا نثر کے ایک بہت اعلیٰ اور ابتدائی حصے سے انکار کرنے کے مترادف ہے۔ اس کے بعد سر سید کے ادبی سلسلہ ہائے کی طرف نظر دوڑائیں تو ان کی کتب اور تصانیف کی فہرست بہت طویل ہے۔ انہوں نے نثر کے میدان میں موضوعات اور اسلوب کے لحاظ سے ایسا تنوع بخشا کہ انسانی فکر کی نئی جہتیں وا ہو گئیں۔ نئے نئے عنوانات جو کہ بالکل زبان زد عام تھے کو زیر بحث لا کر ان کے بارے میں آگاہ کیا اور اپنی رائے بھی کسی حد تک شامل حال کی۔ اگر سر سید کی نثری خدمات کو چند مخصوص اور مختصر جملوں میں واضح کرنا ہو تو ہم اپنی گفتگو کا حاصل بحث یہ نکال سکتے ہیں کہ سر سید احمد خان ہی وہ پہلے مضمون نگار تھے، جنہوں نے پرانی تہذیب و روایات سے ہٹ کر آزادی رائے سے اپنے خیالات کو الفاظ کے قالب میں ڈھالا، اور دوسروں پر تنقید و تقلید کرنے کی بجائے اپنی آواز اٹھائی اور اپنی بات دوسروں تک پہنچائی۔ اور ایک ایسی درسگاہ کی بنیاد رکھی جس کے بنیادی افعال، عقل، نیچر، تہذیب و تمدن اور مادی ترقی تھے اور اگر کسی حد تک انیسویں اور بیسویں صدی کے ادوار کا جائزہ لیا جائے تو انہی افعال کی گونج ہر جگہ پر برابر سنائی دے رہی تھی، سر سید نے اردو ادب کو ایک نئی اور تخلیقی سوچ سے ہمکنار کیا۔ سر سید کے عمل و کردار کی بنیاد ان کے مخصوص قسم کے عنوانات تھے جو خالصتاً مادیت، عقلیت، اجتماعیت اور حقیقت شناسی پر مبنی تھے۔ انہی خصوصیات کی وجہ سے اس دور کا نہیں بلکہ عصر حاضر کا سارا ادب متاثر نظر آتا ہے۔ سر سید بنیادی طور پر مادیت

پرست تھے۔ ہر شعبے ہائے ادب میں انہوں نے اپنی آواز اپنی رائے کو قلمبند کیا لیکن ہر جگہ ان کا قلم ان کی زبان نہ بن سکا۔

ب) سرسید احمد خان کے مضامین کا فکری جائزہ:

سرسید کے مضامین ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی ادب اور تہذیب سے متاثر ہونے کی ایک واحد علامت ہے۔ اس سے قبل ہندوؤں نے ۱۷۹۹ء میں ہندوستان پر انگریزوں کے کامل قبضے کے بعد تعلیمی لحاظ سے جو کامیابیاں حاصل کی تھی مسلمانوں نے ان سے کوئی سروکار نہ رکھا جس کی وجہ سے وہ کم وبیش پانچ دھائیوں تک تعلیمی لحاظ سے مکمل زوال پذیر رہی۔ سرسید اور ان کے ہم نواوہ پہلے ذی شعور افراد تھے جنہوں نے مسلمانوں کی اس کمزوری کا پوری طرح ادراک کرنے کے بعد اس صورتحال سے نکلنے اور اسے بدلے کی سعی کی۔ سرسید کے دس مضامین کو اخلاقی و اصلاحی موضوعات کے حامل ہیں۔ دو باتوں کی جانب اشارہ کرتے ہیں اولاً یہ کہ مسلمانوں کی بالخصوص اور ہندوستان کی دیگر قوموں کی بالعموم معاشی اور معاشرتی صورتحال نہایت سنگین ہے اور دوسرا یہ کہ اردو شعراءاور ادباء ابھی تک حالات کی سنگینی کا پوری طرح سے ادراک نہیں پائے کہ وہ اپنے آپ کو بدلنے کی جرات اور ہمت نہیں پاتے۔ اسی صورت حال میں جہاں برصغیر کی عوام کی معاشی حالات خراب ہو رہے تھے اسی قدر اخلاقی اور تہذیبی تباہی ان کا مقدر بن گئی۔ انگریزوں کے اقتدار پر قبضے کے ساتھ چھاپہ خانے کی مقبولیت کے اضافے نے خطاطوں کی قدر ختم کر دی اور ایک ہی طرح سے لکھی گئی کتابوں کا حصول ناممکن نہ رہا۔ صنعتی اور مواصلاتی انقلاب کی آمد کے ساتھ ہی ہندوستان میں مروجہ بہت سی روایات قصہ پارینہ بن گئیں۔ اخلاقی تناظر کے تنازل میں اور انگریزی تعلیم کے گریز کے سبب سرسید نے جس رسالے تہذیب الاخلاق کا اجراء کیا تھا اس میں چھپنے والے مضامین اس وقت کی مکمل تصویر پیش کرتے ہیں۔ سترھویں صدی میں یورپ میں صنعتی انقلاب اور سائنسی فکر نے عقل پر مبنی بحثوں کو رواج دیا اور اسی وجہ سے بیکن کے مضامین نہ صرف خواص و عوام میں مقبول ہوئے بلکہ یورپ سے باہر ہندوستان جیسی انگریزی مقبوضات میں بھی اس طرز فکر نے مقبولیت حاصل کی۔

بیکن کے مضامین کے عنوانات بالکل وہی ہیں جسے سرسید نے اپنے مضامین میں واضح کیا ہے لیکن سرسید کے مضامین اور بیکن کے مضامین میں دو بنیادی فرق نمایاں نظر آتے ہیں اولاً یہ کہ سرسید انگریزی ادب سے آگاہی ضرور رکھتے تھے مگر تہذیبی فرق کے سبب انگریزی ترجمہ کرنے سے قاصر رہے دوم یہ کہ ہندوستان کے لوگوں کو سمجھانے کے لیے سرسید نے برصغیر کی مثالیں دینا زیادہ مناسب سمجھا۔ سرسید کے مضامین اپنے سخت معروضی سوچ اور غیر مزاحیہ انداز کے آئینہ دار ہیں۔ یہ خوبی انہیں بیکن کے طرز فکر سے قریب کرتی ہے اور ایک دوسری مماثلت جو سرسید کے مضامین میں ہمیں نظر آتی ہے وہ یہ کہ دوسروں کی طرح سرسید بھی مذہبی مثالیں دینے سے گریز نہیں کرتے۔ مذہبی معاملات میں ان کا مطمع نظر بیکن کی طرح غیر جذباتی نہیں ہوتا بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ اپنے دلائل کو برتر سمجھتے ہوئے قارئین کو بزورِ شمشیر قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جیسا کہ ان کے مضمون **"ریا"** میں درج ہے کہ:

> مقدس داودؑ نے نہایت دلچسپ لفظوں میں اس برائی سے پناہ مانگی ہے اور اس طرح خدائی مناجات کی ہے۔ کون اپنی غلطیوں کو سمجھ سکتا ہے تو ہی مجھ کو میرے پوشیدہ عیبوں سے پاک کر، جو لوگ اعلانیہ بدی کرتے ہیں اگر ان کو بدیوں اور گناہوں سے بچانے کے لیے نصحیت کی ضرورت ہے تو وہ لوگ جو در حقیقت موت کی راہ پر چلتے ہیں اور اپنے تئیں نیکی اور زندگی کے رستے پر سمجھتے ہیں کس قدر رحم کے لائق ہیں اور کسی نصحیت کے محتاج نہیں۔[۴]

بیکن کا انداز تمہیں کہیں سرسید کے انداز سے اس طرح مختلف نظر آتا ہے وہ مثال بیان کرتے ہوئے اپنا آپ ظاہر نہیں کرتے اور کسی کتاب سے منسوب یا کسی قد آور شخصیت کا قول درج کر دیتے ہیں بیکن سرسید بذات خود اپنی عقل کے مطابق لوگوں کو سمجھاتے ہیں۔ ایک اور جگہ سرسید اپنے مضمون ریا میں لکھتے ہیں کہ:

> جن سے وہ بدیاں جو دل کے کونوں میں چھپی ہوتی ہیں اور جن کے چھپے رہنے سے انسان خود اپنے دل کا سچا حال آپ نہیں جان سکتا معلوم ہو سکیں۔[۵]

سر سید کے مضامین بیکن کی مانند نہایت غور و فکر کے بعد لکھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کا مشاہدہ نہایت عمیق اور مثالوں کو انسانی زندگی کے ساتھ منسلک کرنے کا طریقہ نہایت دلچسپ ہے، سر سید اپنے مضمون **"بحث و تکرار"** میں بیان کرتے ہیں۔

> جب کتے آپس میں مل کر بیٹھتے ہیں تو پہلے تیوری چڑھاتے ہیں پھر دوسروں کو بری نگاہ سے آنکھیں بدل بدل کر دیکھنا شروع کرتے ہیں، پھر تھوڑی تھوڑی گونجیلی آواز ان کے نتھنوں سے نکلنے لگتی ہے، پھر تھوڑا سا جبڑا کھلتا ہے۔ جو کمزور ہوا دم دبا کر بھاگ نکلا۔[۶]

اپنے اسی مضمون میں نامہذب لوگوں کی مجلس کا بھی بعین ہی نقشہ کھینچا ہے۔ ان کا یہ مشاہدہ بیان کرتا ہے کہ انہیں انسانی نفسیات کے ساتھ ساتھ جانوروں کی نفسیات سے کس قدر آگاہی ہے۔

کہیں کہیں ان کا ناصحانہ انداز حد سے بڑھ جاتا ہے اور کسی قدر گراں بہا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے مضمون **"تعصب"** میں قلمبند کرتے ہیں کہ:

> تعصب غالباً سب سے زیادہ خطرناک بیماری ہے جو آج کل ہمارے عوام، ہمارے خواص، ہمارے جہلا اور ہمارے علماء میں نہایت کثرت سے پھیلی ہوئی ہے۔[۷]

ان کا انداز بیاں جس میں مزاج کی کوئی علامت پائی نہیں جاتی انسانی طبعیت پر کوئی اچھا اثر نہیں چھوڑتی۔ اقوال اور فارسی اور عربی کی علامات ان کے وسیع مطالعہ کی گوائی دیتے ہیں۔ ان کی فکر بلخصوص مسلمانوں کے لیے نہایت دلاوزانہ ہے وہ اپنی باتوں سے کبھی کبھی دل کو خوش کرنے والے نکات نکال لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کے تمام شعبوں میں بھرپور سرگرمی کے ساتھ مسلمانوں کا حق ہی نہیں بلکہ ان پر فرض ہے۔ وہ احکام شہریہ کی سخت بجا آوری کے قائل ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ انسانیت کی نفی بھی کرتے ہیں۔ ان کی سوچ ہمیشہ مسلمانوں کی خیر خواہی پر مبنی ہوتی ہے۔ اپنے مضمون مسلمانوں کا افلاس میں وہ کہتے ہیں کہ:

مگر نہایت افسوس ہے کہ مسلمانوں کا حال روز بروز بدتر ہوتا جارہا ہے۔ مفلسی ان کو گھیرتی جاتی ہے۔ جرائم میں وہ مبتلا ہوتے ہیں یا جیل خانے ان سے بھرے جاتے ہیں۔[۸]

سر سید تاریخی حوالوں کے ساتھ ساتھ حالیہ واقعات بھی بیان کرتے ہیں اور اخباری حوالے دے کر مسلمانوں کو موجودہ حالات سے واقف کرنے اور اچھا قدم اٹھانے کی تلقین کرتے آتے ہیں۔ مسلمانوں کا افلاس کے عنوان سے مضمون سے انہوں نے انگریزی اخبار انڈین پبلک آسینین کا حوالہ دیا ہے۔

سر سید کا انداز بیان فلسفیانہ اور منطق پر مبنی ہوتا ہے وہ مضمون کے شروع میں ایک ایسا نقطہ لاتے ہیں جو بعد کے تمام مضمون میں نمایاں نقطہ کے طور پر دکھائی دیتا ہے ان کی اہم بات بھی فلسفیانہ ذوق سے خالی نہیں ہوتی انسانی عادات افعال اور سوچوں کا مطالعہ کرتے ہیں اور اس کے بعد کسی مضمون کے آغاز میں اس نقطے کو بیان کر دیتے ہیں۔ بیکن کی مانند وہ بات کو پرت در پرت کھولتے ہیں۔ لیکن ان کا اور بیکن کا یہ فرق ہے کہ بیکن آخر میں عمومی رائے بیان کرتے ہیں جیسا کہ سر سید ایک قومی رہنما ہونے کی وجہ سے کسی نقطے کے بیان میں اپنا نقطہ نظر بیان کرنے سے نہیں چھوٹتے۔ بلاشبہ ان کا یہ انداز بیان اس وقت کی ضرورت کے عین مطابق بھی ہے۔ اپنے نقطہ نظر کو واضح بیان کرنے کی وجہ سے ان کا طرز تحریر اور سوچ انہیں بیکن سے ایک وجہ سے ممتاز کر دیتا ہے بیکن کسی بھی صورت اپنا نقطہ نظر بیان کر کے لوگوں کو راغب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سر سید نے اپنے انداز بیان میں انتہائی سادہ زبان اور اختصار کی خوبیاں بھی شامل کی ہیں تاکہ بات کو سمجھانے میں آسانی رہے۔

سر سید تین طرح سے مصلح کا کردار نبھاتے نظر آتے ہیں۔ چونکہ اس دور میں سر سید نے سیاسی جماعت بنانے کی مخالف کی تھی اور ۱۸۸۸ء میں اے۔ او۔ ہیوم نے جب انگریزی طرز کی جمہوریت کو ہندوستان میں متعارف کروانے کے لیے انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی تو ہندوؤں کی بڑی تعداد نے اس میں شمولیت اختیار کی۔ سر سید چونکہ ماضی تحریک میں ۱۸۶۷ء میں اردو ہندی تنازع کو دیکھ چکے تھے لہٰذا انہوں نے کانگریس میں مسلمانوں کو شامل ہونے سے سختی سے منع کیا۔ ایک دیگر وجہ جو نظر آتی ہے وہ یہ کہ مسلمانوں کی سمجھ بوجھ اتنی زیادہ نہیں تھی کہ انھیں ہندوؤں کی مکاری اور دغابازی سے مکمل آگاہی حاصل

ہو اس وجہ سے سر سید نے ایک نئی جماعت کی بنیاد ڈالنے سے زیادہ بہتر سمجھا کہ خود ایک سیاسی مصلح کی صورت میں سامنے آئے۔ ان کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ کافی تعداد میں کانگریس میں مسلمانوں کی شمولیت کو پسند نہیں کیا۔ انہوں نے کئی مضامین مسلمانوں کی سیاسی تربیت کرنے میں لکھے۔ بعد میں ان کے رفقاء نے ان کی وفات کے چھ یا سات سال بعد مسلم لیگ کی بنیاد رکھی، جو سراسر سر سید کے افکار کی بنیاد پر قائم کی گئی تھی۔ سر سید جو ابتدائی دور میں عوامی اتحاد کے پر زور مبلغ تھے اردو ہندی تنازعے میں ہندوؤں کے مکروہ کردار کی وجہ سے مسلمانوں کے حقوق کے حصول کے لیے کمر بستہ ہوئے بعد میں انگریز سرکار کے ساتھ ہونے والے کئی معاہدوں سب کوٹہ سسٹم کا نفاذ اور ملازمتوں کے مواقع میں اضافہ ان کی فکر کی بنیاد پر کیا گیا۔

مخالفت:

مضمون مخالفت میں سر سید نے مکالمے اور ایک دوسرے کی بات کو افہام و تفہیم اور برداشت کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت کی بات کی ہے، چونکہ ان کی فکر انگلستان کے دورے کے بعد مکمل طور پر تبدیل ہو گئی تھی اور اسی وجہ سے انہوں نے سیاسی بحثیں ہوں یا علمی بحثیں یا زندگی کے دیگر معاملات ہوں میں افہام و تفہیم اور تدبر سے کام لینے کو بہتر سمجھا۔ وہ رائے قائم کرنے سے متعلق کہتے ہیں۔

> دنیا میں یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ تمام لوگ ایک رائے پر ہوں گو وہ کیسی ہی صحیح و سچ ہو متفق ہو جاویں۔ پس ضروری ہے کہ آپس میں اختلاف رائے ہو۔ نیک آدمی اپنے مخالف کی رائے کو نہایت نیک دلی سے سوچتا ہے اور ہمیشہ یہ ارادہ رکھتا ہے کہ اگر اس میں کوئی اچھی بات ہو تو اسے چن لو اور اگر مجھ میں کوئی غلطی ہو تو اس کو صحیح کر لوں اور جب ایسی کوئی بات اس میں نہیں پاتا تو اپنے مخالف کی غلطیوں کی اصلاح کے درپے ہوتا ہے۔[۹]

مضمون سمجھ:

مضمون "سمجھ" سر سید کے مضامین میں انسان کی معاشرتی زندگی سے متعلق ایسا مضون ہے جس میں سمجھ کی اصلاح کو استعمال کرتے ہوئے اصل میں وفا، سچائی اور راست بازی کی خوبیوں کا انسانی فکر اور معاشرے پر اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ سر سید دراصل ہندوستانی معاشرے کو اسلام کے ان سنہرے اصولوں سے مزین کرنا چاہتے ہیں جو قرون اولیٰ میں مسلمانوں کے لیے باعث افتخار رہی مگر معاشرے میں داخل ہو چکی تھیں جن کا رد کرنا ایک نہایت مشکل کام تھا۔ سر سید نے اپنی اوالعزم شخصیت کی بدولت ان برائیوں کو ختم کرنے کی کوشش کی۔

علوم جدیدہ:

سر سید نے اپنے مضمون "علوم جدیدہ" میں مذکورہ اصلاح کی وضاحت کی ہے اور علوم جدیدہ سے مراد ان مضامین کو قرار دیا ہے جو سائنس اور مذہب دونوں میں شامل ہیں۔ البتہ اسی مختصر مضمون میں پیش کئے گئے ان کے اپنے ذہنی اور علمی پس منظر سے تعلق رکھتے ہیں۔

عزت:

سر سید کا مضمون "عزت" دراصل بر صغیر کے معاشرے میں بڑھتی منافقت اور چاپلوسی کے بڑھتے پھیلاؤ پر ایک زبردست اور کاری وار کی حیثیت رکھتا ہے۔ دراصل صدیوں کی غیر منصفانہ رواجوں اور قوانین میں ہندوستانی معاشرت کو ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا جب ان سماجی بیماریوں کی تشخیص اور علاج نہایت ضروری ہو چکا تھا۔ سر سید نے چند نکات کی مدد سے اس عارضے کی شناخت اور اس کے سدِ باب کی تجاویز شامل کی ہیں جو اس وقت کے لوگوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہیں کیونکہ یہ مضمون ایسے مسئلے سے متعلق ہے جو آج کے معاشرے میں بھی پوری طرح داخل ہو چکا ہے لہٰذا مضمون کی تازگی اور معنی آج بھی ممکن اور تازہ محسوس ہوتی ہے۔

سر سید کا انداز بیان اس بات کا شاہد ہے کہ انہوں نے انگریزی معاشرے میں افہام و تفہیم ،سیاسی بالغ نظری اور ایک دوسرے کی بات کو سننے اور عقل کی بنیاد پر اس کو رد کرنے یا اپنانے کی خصوصیت ملاحظہ کی تھیں۔ انہیں ہندوستانی معاشرے میں جاری کرنے کی شدید خواہش رکھتے تھے۔

عزم جزم:

عزم جزم دراصل تہذیب الا خلاق کے اجراء کے جواز کی فراہمی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تحریر کیا گیاہے۔ یہاں تعلیم و تربیت کی تکمیل کے بعد فیصلہ سازی کی قوت کے بارے میں اظہار خیال کیا گیاہے۔ "عزم جزم" مضمون انسان کے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کی صلاحیت پیدا کرنے کو دعوت دیتاہے۔ کیونکہ تعلیم و تربیت ہی وہ وسیلہ ہے جس کی مدد سے برے بھلے کی تمیز میں آسانی رہتی ہے گو تعلیم انسان میں ایک خاص قسم کی جھجھک کا سبب بھی بنتی ہے کیونکہ وہ سوچے سمجھے بغیر کسی بھی اقدام سے گریز کرتا ہے مگر صحیح قدم اٹھانے پر اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کی جانب قدم بڑھا سکتا ہے۔

تہذیب الا خلاق کے اجراء سپیکٹیٹر اور ٹیٹلر کی طرز کو اپنانے اور مضامین کے لکھنے میں فرانسز بیکن کا انداز بیان اپنانے میں ان کا یہی مقصد پوشیدہ نظر آتا ہے،وہ اس بات کو سمجھ چلے تھے کہ آئندہ عوام کو صرف نعروں کی بنیاد پر تقسیم کرنا ممکن نہیں رہے گا اسی لیے انہیں کچھ ایسے بیانیے کی ضرورت تھی جس کو اساس بنا کر مسلمانوں کو متحد اور عصری تعلیم سے بہرہ مند کیا جائے۔

> انسان پر ایک ایسا زمانہ آتا ہے جس میں اس امر کا تصفیہ زیادہ تر عظیم الشاں ہو جاتا ہے جب وہ اپنی ضروری تعلیم و تربیت سے فارغ ہو جاتا ہے اور ایک قسم کی تمیز اور سمجھ حاصل کرتا ہے۔ تب اس کو پھر اپنے آپ سے پوچھنا ہوتا ہے کہ میں کیا ہوں گا اور کیا کروں گا۔ اگر وہ اس کے تصفیہ پر قادر نہیں ہوتا تو ہمیشہ خراب وخستہ رہتا ہے۔[۱۰]

تحریک کے آغاز سے ہی سر سید کے پیش نظر جن مقاصد کا حصول رہا وہ وفات تک ان کو ہمیشہ زیادہ عزیز رہے۔ اپنی تمام زندگی ایک ہی مقصد سے منسلک کرنے کی وجہ سے ان کی سوچ میں ایک خاص طرح کی

دانائی اور دیگر امور سے بیگانگی آگئی تھی۔ ۱۸۵۷ء سے قبل کا سر سید جنگ آزادی کے بعد کے سر سید سے مکمل تبدیل نظر آتا ہے۔ زندگی کا یہ تحول بڑی قربانیوں کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ ایک دم ذاتی خواہشات کو پس پشت ڈال کر اجتماعی خوشیوں اور خوشحالیوں کے اسباب پیدا کرنا نہایت ہی عزم کا تقاضا کرتا ہے۔

ہمارے رؤسا اور قومی بھلائی:

یہ مضمون "ہمارے رؤسا اور قومی بھلائی" دراصل مذہب اور معاشرت کی جڑوں کو تلاش کرتے ہوئے ہندوستان کے قد آور شخصیات کو قومی بھلائی کے ان کاموں کی طرف راغب کرنے جن کی مدد سے نہ صرف غربت میں کمی لائی جاسکے بلکہ ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینے کی کوشش کی جائے جس میں ہر فرد دوسرے فرد کا خیال رکھے اور معاشی خلیج پُر کرنے کی کوشش کی جائے۔

سر سید احمد خان نے علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام کے دوران ہندوستان کے طول و عرض کے دورے کیے۔ مختلف علاقوں کے دوروں کے دوران نہیں زمین کی تقسیم اور وسائل کے غیر منصفانہ تقسیم کا احساس ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ مضمون میں اپنی رائے کو مقدم جانتے ہوئے انہوں نے تمام تر حالات کو بہتر بنانے کے لیے لوگوں میں شعور پیدا کرنے اور اس وقت کی مقتدر حکومت انگلشیہ کو چند قیمتی مشورے دیئے ہیں۔

سر سید کے بعض مضامین پر اگرچہ وقت کے مذہبی رہنماوؤں نے بہت سے اعتراضات بھی کئے لیکن غلطیوں کے باوجود ان کی نیت کی پاکیزگی کی سبب راہ میں حائل تمام مشکلات یکے بعد دیگرے ختم ہوتی چلی گئی۔ بعض جگہ ان کی مذہبی راہنماؤں پر تنقید ان کے غم و غصے کی داستان بیان کرتی ہے۔

> ہم کو نہایت افسوس ہے کہ جب ہم مذہبی پیشواؤں کی کوئی کتاب دیکھتے ہیں تو اس میں ایک مذہب والا دوسرے مذہب کے پیشواؤں کا بری طرح ذکر کرتا ہے۔ یہ امر مذہب اسلام کے بالکل برخلاف ہے۔"

سر سید کے پیش نظر ایک نہایت ترقی یافتہ معروضی سوچ کے حامل انگریزی معاشرے کے بالمقابل ایک روایت پرست اور کم تعلیم یافتہ معاشرہ تھا لہٰذا انہیں الفاظ کے چناؤ اور لوگوں کی جذبات کو بھی پیش نظر

رکھنا تھا جس میں انہیں ہر دو گرہوں میں سے کسی ایک گروہ کی ہی رضا حاصل ہو سکتی تھی ان کی سوچ سے موافقت رکھنے والوں کے علاوہ ان کے اس انداز کو ان کے مخالفین نے بھی سراہا۔

سرسید نے اپنے دور کے ادب میں جو تحویل پیدا کیا وہ اتنا معروف ہوا کہ غالب کے بعد سرسید کی زباں و ادب کی خدمات کسی طور فراموش نہیں کی جا سکتی۔ غالب نے خطوط میں عام فہم زبان کو لکھا تو سرسید نے اس کے برعکس سنجیدہ مضامین میں برتا۔ سرسید نے اپنے مطمع نظر کو نہایت سلیس انداز میں اور رابطے کی زبان میں اس طرح ادا کیا کہ بعد میں آنے والے دیگر ادیبوں اور محققین کے لیے مشکل راہ کے طور پر زندہ رہا۔ آج تک تحقیق اور تنقید میں جذباتیت اور لسانی تعصب کو پس پشت ڈال کر معروضی انداز بیاں سرسید کی دین ہے۔ سرسید نے بعض مضامین نہایت طویل لکھے ہیں جس کی طوالت کی اتنی ضرورت نہیں تھی۔ ان مضامین میں سرسید نے بات کو سمجھانے سے زیادہ خود ایک عالمانہ انداز اختیار کرنے کی کوشش کی اور دیگر لوگوں کی رائے کو پس پشت ڈال کر اپنی سمجھ بوجھ سے کام لینے کی کوشش کی۔ ان کا یہی رویہ بعض جگہ اس قدر زیادہ ہوا کہ وقت کے مذہبی راہنماؤں نے ان کے خیالات کا انہیں منکر خدا ملہد قرار دیا۔ یہ بات صحیح ہے کہ وہ اپنے مقصد سے خون کی حد تک لگاؤ رکھتے تھے اور بیک وقت کئی تعلیمی اداروں کے ساتھ مضامین نویسی اور رسالے کے مدیر کے طور پر خدمات کے علاوہ علی گڑھ مدرسے کی ضروریات کے لیے چندہ اکٹھا کرنے کی غرض سے ملک کے طول و عرض کا دورہ کرنا غیر معمولی عزم و ہمت کا طلبگار ہوتا ہے۔ ان بہت ساری معروضیات کے باوجود مضمون نویسی کے لیے وقت نکالنا اور ادب پر توجہ دینا نہایت مشکل اور صبر آزما مرحلہ تھا۔ شاید اسی وجہ سے انہوں نے اپنے خلاف چلنے والی مہم کی جانب توجہ نہیں کی اور نہ ہی اپنے مقصد کی خاطر انہوں نے دیگر مذہبی اور معاشرتی اقدار کا لحاظ رکھا۔

مذہب اور معاشرت:

سرسید نے اپنے مضمون "مذہب اور معاشرت" میں مذہب کے انسانی معاشرے پر مثبت اور منفی پہلوؤں کے بارے میں بحث کی ہے۔ ان کے نزدیک کوئی مذہب انسانوں کی تقسیم اور مذہب اور رنگ و نسل کی بنیاد پر ان کی تفریق کو جائزہ نہیں سمجھتا۔

سر سید در حقیقت ایک ایسے معاشرے کے قیام کے لیے کوشاں تھے جس میں ایک دوسرے کے جذبات، احساسات اور اعتقادات کو پورا احترام دیا جائے اور عقائد اور نسل و زبان کی مدد سے ایک دوسرے سے نفرت کو فروغ دینے سے گریز کیا گیا۔

سر سید کی زندگی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں تاریخ سے خصوصی لگاؤ تھا لہٰذا جنگ آزادی کے علاوہ مغل فرمانرواؤں سے متعلق تاریخی کتب اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ وہ برصغیر کی تاریخ پر بڑی گہری نگاہ رکھتے تھے چنانچہ مضامین لکھتے وقت ان کا داستان گویانہ انداز ان کے تاریخ پر نظر ہونے کی پہچان ہے ،وہ تاریخی واقعات کو بیان کرتے ہوئے اس کا تجزیہ کرتے ہیں اور پھر اپنی فہم کے مطابق اس میں تبدیلی لے کر آتے ہیں۔ انجیل کا مطالعہ کرنے کے بعد انہوں نے اپنے بعض مضامین میں انجیل مقدس کے واقعات یا اس میں آیات کے حوالے سے بھی اپنے مضامین کو مرصع کیا ہے۔ سر سید نے بعض اوقات اچھے معاملات میں انگریزوں کی پیروی کرنے کے لیے دلائل دیے ہیں۔

> دنیاوی سرداری سے متعلق آنحضرت صلعم بھی بی مثل حضرت موسیٰؑ کے اپنے صحابہ کے مشورے سے اور ضرورت و مصلحت وقت کے لحاظ سے احکام صادر فرماتے تھے اور یا تو یہودیوں کی پیروی یا اسی لازمی نتیجے سے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا، آنحضرت صلعم نے بھی دنیاوی امور کی نسبت جو کچھ کیا یا فرمایا یا بطور زبانی احکام کے سمجھا گیا اور لوگوں نے وَانتم اعلم نامور دنیا کو یک لخت بھلا دیا۔[۱۲]

سر سید نے سائنسی طرز فکر کی بنیاد پر دلائل و براہین پیش کرنے اور اپنی بات کو زیادہ پر اثر بنانے کے لیے دیگر ذرائع استعمال کرنے سے گریز نہیں کیا۔ یہ چونکہ آسان نثر لکھنے کا ابتدائی زمانہ تھا اور لوگوں نے ابھی ابھی نثر کی جانب توجہ کی تھی لہٰذا مضامین میں جگہ جگہ شعر کی مدد سے بعض نکات کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی لیکن اردو مضامین کے بانی ہونے کے ناطے ایک یا دو شعر نقل کرنے کی بجائے ایک دم پوری غزل یا نظم کے اشعار پیش کیے گئے جس سے مضامین کے فکری تسلسل اور یگانگت میں کسی کسی جگہ خلاء نظر آتا ہے۔

ج) سر سید کے مضامین کا فنی جائزہ:

سر سید کے مضامین اردو ادب میں ابتدائی مضامین شمار ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے اردو ادب میں انشائیہ نویسی کا کوئی نمونہ موجود نہیں تھا اور انہیں نثر میں اپنے خیالات کے منضبط اظہار کے لیے مضمون سے بہتر کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ مزید بر آں انگریزی ادب کے مقالے اور اس وقت کے نامور مضمون نگاروں بالخصوص فرانسز بیکن سے انہوں نے گہرا اثر قبول کیا، صرف مضامین کے عنوانات ہی نقل نہیں کئے بلکہ مضامین کے لیے بیشتر خیالات کا منبع بھی مضامین بیکن ہیں۔

بیکن کے مضامین کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے مضامین کے لیے عام فہم موضوعات تلاش کیے لیکن ان کا نقطہ نظر بیان کرنے کا طریقہ عام فہم نہیں بلکہ فلسفیانہ ہے۔ سر سید کے مضامین بھی بیکن کی مانند ہیں لیکن بیکن کے مضامین کے بر عکس مضامین سر سید میں لسفیانہ خیالات کی بھی مار نظر نہیں آئی اور نہ ہی سر سید نے عوام الناس کو اپنی انشاء پر دازی اور زبان دانی سے متصل کرنے کی کوشش کی جب ہم سر سید کے مضامین کا فنی جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں تو اس میں دو چیزین نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہیں۔ اولاً سر سید کا عام فہم اور غیر متاثر کن انداز بیاں اور دوسرا یہ کہ مضامین سر سید ایک خاص مقصد کے حصول کے لیے تحریر کئے گئے۔ سر سید کے پیش نظر ظاہری زیبائش اور انشاء پر دازی کے کمالات سے زیادہ عام فہم انداز بیان زیادہ اہمیت کا حامل تھا تا کہ اپنے پیغام کو پوری طرح سے پہنچا سکے۔ ایک اور پہچان جو ہمیں نمایں طور پر نظر آتی ہے وہ یہ کہ سر سید ایک ذود نویس ادیب تھے لہٰذا انہوں نے انشاء پر دازی کے بجائے مقصد کو زیادہ پیش نظر رکھا۔ ظاہر ہے ایک رسالے اور اخبار کے مدیر کے طور پر انہیں یہی انداز بھاتا ہے جس کی وجہ سے انہیں بعد میں کچھ مذہبی رہنماؤں کی جانب سے طنز و تشنیع کا نشانہ بھی بننا پڑا۔

مسلمان کئی صدیوں سے پوری دنیا بشمول بر صغیر میں فکری جمود کا شکار تھے ایسے میں ٹھہرے پانی میں پتھر پھینکنا ان کے ساتھ لڑائی مول لینے کے مترادف تھا۔ سر سید کی اسی جرأت نے جہاں انہیں کئی نظروں نے محترم حیثیت دی وہاں بہت سارے کوتاہ نظر مسلم راہنماؤں نے انہیں راہ سے بھٹکانے اور ان کا مرتبہ کم کرنے کی کوشش کی۔ یہ بات لازم ہے کہ بہت زیادہ لکھنے کی وجہ سے انہوں نے ناداستگی میں مسلمانوں کے کسی

فریق کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ اس سے بھی بڑی بات یہ کہ اسی سبب ان کی مضمون نویسی میں بیکن جیسا کروفر زبان دانی کے جوہر اور وابستگی کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ سر سید اور سر فرانسز بیکن کے مضامین میں نمایاں فرق یہی ہے کہ ان کی زبان دانی اس وقت کے مروجہ اصول سے ہٹ کر سادہ بیانی پر مشتمل تھی۔ مضامین کے لکھنے میں انجیل، تورات اور تاریک جہاں کے حوالہ جات ضمنی طور پر بیان ہوئے ہیں نہ کہ ان واقعات کے بیان سے انہوں نے اپنے علم ہونے کا سبب بنایا۔ ایک دوسرا فرق جو ان کے مضامین کے مطالعے سے نمایاں ہوتا ہے، وہ تشبیہات و استعارات کا کم سے کم استعمال ہے۔ گو شعروں کا استعمال اس وجہ سے زیادہ دکھائی دیتا ہے کہ اس وقت نثری نمونوں میں شعروں کا استعمال بے حد زیادہ تھا۔

سر سید کے مضامین عنوانات کے ساتھ ساتھ بیکن سے دیگر وجوہات کی بنا پر بھی مختلف دکھائی دیتے ہیں ایک فرق یہ کہ ایک ہندوستانی ہونے کے ناطے اور ملک میں انگریزی کے نئے رواج کی وجہ سے ان کا انگریزی ادب کا مطالعہ بہت زیادہ نہیں تھا لہٰذا مضامین لکھتے وقت انہوں نے سوائے عنوان کی نقل کرنے کے دیگر نکات پر دھیان نہیں دیا بلکہ ہندوستان کے لوگوں کی سمجھ بوجھ کے مطابق اپنے طور پر ان نکات کو بیان کرنے کی کوشش کی۔ سر سید کے مضامین میں اکثر اوقات خطیبانہ انداز نمایاں نظر آتا ہے جیسے پس اے میرے عزیز ہم وطنو! یا اس جیسے دیگر خطیبانہ انداز ان کی مضمون نویسی کہ فرانسز بیکن کے انداز سے الگ بناتے ہیں، فرانسز بیکن نے تشبیہات و استعارات اور مشکل زبان کو استعمال کیا ہے تاہم یہ خیال ضرور رکھا ہے کہ کوئی ایسا لفظ یا کلمہ تحریر نہ ہونے پائے جو کسی کی دل آزاری کا سبب بنے۔ فرانسز بیکن کا انداز ایک معلم اخلاق سے زیادہ داستان گو کا ہے جو اپنی زبان دانی اور انشاء پردازی کے زور پر ایک عام فہم بات کو فلسفیانہ رنگ دینے میں کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے برعکس سر سید کا انداز مخاطب کو بے تکلفی سے پکارنے کے ساتھ واعظانہ منظر پیش کرتا ہے۔ بیکن کی مانند سر سید بھی اپنی بات کو مدلل بنانے کے لیے مثالوں سے کام لیتے ہیں۔ لیکن سر سید اور بیکن میں ایک فرق حالات و واقعات کا ہے۔ سر سید کے پیش نظر فکری پستی کے گرداب میں گھیر لی لیکن قوم کو صحیح منزل کا نشان بتانا تھا لیکن دوسری جانب بیکن کے نزدیک مضامین لکھنے پر ایسا کوئی مقصد پیش نظر نہیں تھا یہی وجہ ہے کہ سر سید نے مضامین کے آخر میں اور بعض احکامات مضامین کے دوران ہی عوام سے

ان کی رائے طلب کرنے کا کام کیا ہے۔ جو کہ ظاہر ہے کہ مضامین میں مخاطب کرنے سے اس بات کا پتہ نہیں چل سکتا کہ آپ کے دلائل برائین فاطمہ سے کتنے لوگ متاثر ہیں۔ بیکن نے اپنے مضامین میں کوشش کی ہے کہ کوئی سستی بات باجملہ ان کی قلم سے سرزد نہ ہونے پائے۔ سرسید کے پیش نظر یہ اصول ضرور تھا لیکن ان کے مخاطب انگریزوں کے طرح پڑھے لکھے لوگ نہ تھے بلکہ نیم خواندہ مسلمان تھے۔ لہٰذا بیکن کا انداز سرسید کے لیے قابل قبول نہ تھا۔ سرسید نے اکثر اوقات قرآن مجید، تورات اور زبور و انجیل کی مثالوں سے قارئین کو مخاطب کیا۔ مولانا الطاف حسین حالی اپنی کتابِ حیات جاوید میں لکھتے ہیں:

> چنانچہ اس زمانے میں انہیں انجیل اور قرآن کی تطبیق کا خیال آیا اور اس خیال نے ایسا زور پکڑا کہ انہوں نے عبرانی زبان سیکھی اور انجیل مقدس کی ایک ایسی تفسیر لکھنی شروع کی جس سے انجیل اور قرآن کے مشترک مطالب کی تفہیم میں آسانی ہو۔ تبئین الکلام کی تالیف اور اشاعت کہ یہی اس تفسیر کا نام تھا، بہت بڑا کام تھا۔ اس کام کے لیے انہوں نے اپنے ذاتی خرچ سے قائم کیا اور ایک عرصے تک اس کام میں شب و روز معروف رہے۔ ذرا غور کیا جائے تو یہ اقدام بھی ان کی صداقت پرستی اور انسان دوستی کا ایک غیر مبہم ثبوت تھا۔[۱۳]

سرسید نے اپنی دوران حیات میں انگریزوں اور مسلمانوں کو قریب لانے کی جتنی کوششیں کیں اس میں انہوں نے عبرانی زبان سیکھنے کے علاوہ انجیل کی تفسیر بھی لکھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب تہذیب الاخلاق میں انہوں نے انشاء نویسی شروع کی تو لامحالہ اور نادانستہ طور پر تورات و زبور کی مثالیں دینا بھی نہیں بھولے۔ کسی کسی جگہ ان کی مضمون نویسی میں ربط و ضبط کا فقدان نظر آتا ہے جس کی بنیادی وجہ فی البدیہہ لکھنا ہے۔ سرسید نے جن حالات میں مسلمانوں کی تعلیمی اور شعوری حالت میں تبدیلی لانا شروع کی اس وقت اس بارے میں سوچنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ سرسید کے پیش نظر ہمیشہ یہ بات رہی کہ اردو ادب کو صرف اور صرف ادب برائے ادب کے نظریے کے تحت نہ لکھا جائے بلکہ اس میں اصلاح ملی کا قوی عنصر موجود ہو۔

سر سید کے مضامین کا جائزہ لینے سے پتا چلتا ہے کہ یہ تین بنیادی مقاصد کی تکمیل کے لیے لکھے گئے ہیں۔ جن میں سیاسی، معاشی، معاشرتی یا اصلاحی مقاصد زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ ظاہر ہے کہ انگریزوں کے مفادات اور ذہنیت سے مکمل آگاہی کئے بغیر ان کے خلاف لڑنا یا ایک مقتدر قوت سے اپنے معاشی مفادات کا تحفظ ایک غیر معمولی بات ہے جس کے لیے تہذیب الاخلاق یا دیگر رسائل میں لکھنا ہی کافی نہیں تھا۔ بلکہ اس کے لیے غیر معمولی اقدامات کی ضرورت تھی۔ ابتداء میں انگریزی زبان سے مواشنت پیدا کرنے کی غرض سے اردو اور انگریزی تحریروں کو ایک ساتھ ایک ہی صفحہ پر دونوں جانب تحریر کیا گیا۔ پیش نظر یہ مقصد تھا کہ کی طور انگریزی زبان سے مسلمانوں کو نہ صرف آگاہ کیا جائے بلکہ اس زبان میں تعلیم کے حصول کا جذبہ بھی پیدا کیا جائے تو دوسری جانب اس مقصد کا حصول بھی اس تحریک کا لازمہ تھا کہ اس رسالے کے توسط سے انگریز حکام کو مسلمانوں کے جذبہ تعلیم اور معاشی و معاشرتی مسائل سے پورے طور پر آگاہ کیا جائے تا کہ ان کے سیاسی مسائل نہ صرف کم ہوں بلکہ ہر دو قوموں کو ایک دوسرے کا نقطۂ نظر سمجھنے میں آسانی ہو۔ سر سید اور بیکن دونوں ہی کے مضامین اس لحاظ سے ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں کہ نفس مضمون اگرچہ الگ ہیں مگر دونوں کی ذہنی اور جذباتی وابستگی اپنے مقصد کے ساتھ کسی شک و شبے سے بالاتر ہے۔ سر سید کے مضامین میں رواداری کا جذبہ بدرجہ اتم نظر آتا ہے لیکن ۱۸۶۷ء کے اردو ہندی تنازع کے بعد جب انہوں نے اپنے آپ کو صرف اور صرف مسلمانوں کے حقوق کے حصول کی جنگ تک محدود کر دیا تو ان کے مضامین کی نوعیت ایک دکھائی بدینی ہے۔ سر سید کی تحریک کے پیش نظر اردو میں انجمن پنجاب کے زیر سایہ اردو نظم کی ترویج کی جو تحریک شروع ہوئی وہ دراصل سر سید کے خیالات سے مکمل ہم آہنگ تھی۔ سر سید کے مضامین میں فلسفیانہ بحثیں گنجلک نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں مقصد واضع نظر آتا ہے، انجمن پنجاب کے تحت ورڈزورتھ کی شاعری سے متاثث ہو کر فطرت نگاری کی جو تحریک شروع ہوئی وہ سر سید کی عظیم الشان شخصیت کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک پہلو کا احاطہ کرتی ہے۔ ہم سر سید کے مضامین کو چند اہم بنیادوں پر تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ نیچر یا فطرت سے ہم آہنگ شاعری اور نثر کی ترویج۔

۲۔ سائنسی مضامین اور عقلی بحثوں کو شعر و ادب میں نمایاں مقام دلایا۔

۳۔ عقل سے دور اور جذبات کے زیر اثر شاعری اور نثر ان کے ہاں قابل قبول نہیں تھی۔

سر سید نے اپنے مضامین کو تحریر کرتے وقت یہی انداز اپنائے رکھا۔ منطقی حقیقت پسندانہ اور مادیت پر مبنی تحریروں نے اس وقت کے معاشرے میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ افسانہ، ناول، نظم وغیرہ جیسے اصناف ادب اردو ادب میں انہی کی وجہ سے مقبول ہوئے بالخصوص افسانے پر تو ابتداء ہی سے حقیقت پسندی کی تحریک غالب تھی۔ یہی وجہ تھی کہ بہت جلد مسلمانوں نے جذبات مذہبی اور خونی رشتہ داریوں کو پس پشت ڈال کر اپنے حال کو بہتر بنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔

سر سید کے انداز بیاں میں بعض اوقات داستان گویانہ انداز ملتا ہے۔ مگر دلائل کے سبب ان کا یہ انداز گراں بار نہیں گزرتا بلکہ اس میں ایک خاص طرح کی چاشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ اپنے انداز بیان میں وہ کچھ اس نوعیت کی دلچسپی بھر دیتے ہیں کہ قاری بے ساختہ ان کی بات کی جانب متوجہ ہو جاتا ہے۔ وہ انسانی نفسیات سے بھی آگہی رکھتے ہیں۔ اپنے مضمون مذہب و معاشرت میں لکھتے ہیں کہ:

> بانی مذہب جس کو در حقیقت روحانی اصلاح مقصود ہوتی ہے، کبھی کبھی اپنی منصب اعلی سے فروتر درجہ اختیار کر کے دینوی باتوں میں بھی صلاح دینے لگتا ہے۔ یہ ایک قدرتی بات ہے کہ جو شخص کسی ایک بات میں درجہ اعلیٰ رکھتا ہے اور اس کی نیکی اور دیانت داری اور عقل مندی اور لیاقت مشہور ہو جاتی ہے تو ہر شخص ہر ایک بات اس کے سامنے لاتا ہے اور ہدایت چاہتا ہے۔[۱۴]

رسالہ تہذیب الاخلاق میں چھپنے والے مضامین کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ سر سید نے اپنے پیش نظر تین مقاصد رکھے۔

۱۔ ایک خاص قسم کے ادبی مذاق کی ترویج

۲۔ شیکسپیئر اور سٹیلر کی طرز پر اردو میں ادب رسالے کا اجرأ اور اسی طرح کے مضامین کا اردو میں لکھنا۔

۳۔ معاشرتی اصلاحات

دراصل معاشرتی اصلاح میں وہ محرک تھا جس نے اردو ادب میں سرسید کے توسط سے وہ تحول پیدا کیا کہ دوسو سال کے کم عرصے میں اردو ادب کو دنیا کے دیگر ادبوں کی مانند صفحہ اول کی ادب زبان میں لا کھڑا کیا۔ سرسید کے رسالہ تہذیب الاخلاق اور انگریزی ادبی رسالہ شیکسپیئر اور ٹیٹلر میں جو فرق نمایاں نظر آیا ہے وہ یہ کہ ان رسالوں میں لکھنے والے مضمون نگار پہلے ادیب تھے اور بعد میں معاشرتی اصلاح کار جبکہ تہذیب الاخلاق کے ساتھ معاملہ اس کے برعکس تھا۔ تہذیب الاخلاق کے لکھاری اور ایک اعلیٰ درجے کے معاشرتی اصلاح کار تھے۔ جب کہ وہ درجہ دوم کے ادیب شمار ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تہذیب الاخلاق اور شیکسپیئر اور ٹیٹلر کے مضامین میں جو واضح فرق ہمیں دکھائی دیا ہے چاہے وہ معاشرتی ہو، معاشی ہو، اصلاح کا ہو یہ تین صورتوں میں اس کا فرق اتنا ہی نمایاں اور مختلف ہے جتنا کہ سرسید اور بیکن کے مضامین میں نمایاں دکھائی دیتا ہے۔

سرسید کا اندازِ بیان زیادہ تر سپاٹ ہے مگر کہیں کہیں وہ طنز و مزاح سے کام لیتے ہیں۔ ان کا یہ انداز کسی وقت زیادہ دلائل پر مبنی اور خوبصورت ہوتا ہے لیکن ان کے مزاح میں کہیں بھی گری ہوئی بات نظر نہیں آتی بلکہ معاشرے پر طنز کا مقصد اصلاح ہے۔

سرسید کی تحریروں کے اس عنصر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس کو طنز و مزاح کا نام دیا جاتا ہے۔ مزاح، ظرافت کی اس کیفیت کا نام ہے جس کا اثر سننے والے پر خوشگوار ہو۔ طنز کا اثر عام سننے والے پر تو انبساط کا ہو سکتا ہے مگر جو نشانہ اور موضوع ہو اس کے لیے یہ ناگوار بھی ثابت ہو سکتی ہے مگر جس معنی میں انگریزی میں کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ہم اسے ظرافت کے معنوں میں لیتے ہیں جس کی بے شمار قسمیں ہیں۔ ظرافت کی

بعض اقسام کے نمونے سر سید کی تحریروں میں ملتے ہیں۔ مثلاً ان کے مضمون ''بحث و تکرار'' میں واقع کا مزاح پایا جاتا ہے اور اسی طرح ان کے بعض مضامین طنزیہ کیفیت لیے ہوئے ہیں۔ مثلاً ''رسم و رواج'' میں سوسائٹی اور زمانے پر طنز پایا جاتا ہے۔

سر سید کے طنز و مزاح میں مستقل مزاجی کے بجائے جھنجھلاہٹ کی کیفیت ملتی ہے۔ کامیاب مزاح وہی ہے جس میں کھلے پن کے بجائے مخفی انداز اپنایا جائے اور ہلکی مگر طنزیہ مسکراہٹ کی کیفیت پیدا کی جائے۔ یہ اس صورت میں زیادہ مُوثر ہوتی ہیں جب کوئی ادیب دو متضاد کیفیات یا حالات کا موازنہ کرتا ہے تو اس دوران وہ ایک کیفیت کو برتر اور دوسرے کو کم تر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر وہ اپنی کیفیات اور پسندیدگی یا نفرت کو ایک جانب رکھ کر حقیقت پسندانہ تجزیہ کرتا ہے تو اس میں ایک خاص نوعیت کی شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ سر سید کے صرف ایک مضمون بحث و تکرار میں یہ بات نمایاں ہوتی ہے بقیہ دیگر مضامین میں وہ انہی کیفیات کو بغیر کسی تردد کے ظاہر کرتے ہیں جس سے طنز و مزاح میں جانبداری کا احساس نظر آتا ہے اور مزاح کی وہ کیفیت ختم ہو جاتی ہے جو اسے خوبصورت اور پر معنی بناتی ہے۔

سر سید نے مضمون نگاری میں مطلب کی بات کو مثالوں کے ساتھ بیان کرنے کی روایت کی طرح ڈالی۔ سر سید مضمون نگاری کرتے وقت ادبی روایات سے خود کو الگ تھلگ سمجھتے ہیں۔ حال کی مانند ان کی مضمون نگاری میں تحریر کی چاشنی نہیں پائی جاتی ان کے لیے ان کا مقصد اولین حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے سر سید کی مضمون نگاری میں بعض اوقات حسن و انشاء کے پہلوؤں کو دکھائی دیتے ہیں مگر وہ غیر شعوری طور پر یہ سب کرتے ہیں۔ حالی نے ان کے برعکس ادب کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑے رکھنے میں ہی عافیت جانی۔ اسی تناظر میں حالی کا رویہ سر سید کی بہ نسبت بیکن سے زیادہ موضوع نظر آتا ہے۔ ان کی تحریریں اکثر اوقات دلائل اور اپنی بات پر اڑ جانے کی کیفیت سے اس قدر بوجھل دکھائی دیتی ہیں کہ ان میں رکھ رکھاؤ اور جملوں کی ترتیب خراب ہو جاتی ہے۔ اپنی کتاب اسلوب نثر کا ارتقاء میں لکھتے ہیں کہ:

> سر سید کی یہ بے رنگی ان کی ہمہ رنگی کی ذمہ دار ہے۔ سر سید کی تحریروں کی یہ بے رنگی ان کا ایک کارنامہ ہے جس نے ہمہ رنگی کا راستہ سمجھایا۔[15]

فورٹ ولیم کالج کے زیر اثر اردو ادب میں آسان نثر لکھنے کے حوالے سے جن دو یا تین اسلوب ہائے نگار کو فروغ حاصل ہوا۔ سر سید کی ادب خدمات اور آسان اردو نثر کے متعارف کرانے کی خدمات کس کالج سے زیادہ نظر آتی ہیں۔ سر سید تحریک کے زیر اثر عقل و منطق سادہ بیانی زیبائش سے گریز سے جو تحریر عام ہوئی وہ فورٹ ولیم کالج کے زیر سایہ لکھی جانے والی افسانوی نثر کا معیار اس سے کہیں کم تر نظر آتا ہے۔ کیونکہ فورٹ ولیم کالج کے ابتدائی نثری نمونوں میں طبع زاد تراجم کی بھرمار نظر آتی ہے لیکن سر سید کی تحریک میں لکھی جانے والی نثر ہندستان کی سر زمین اور حالات سے زیادہ موافقت رکھی ہے۔

سر سید کا انداز تحریر کسی کسی جگہ مغرب کی بے لاگ تعریف و تحسین پر مبنی دکھائی دیتا ہے۔ سر سید نے ایک جگہ لکھا ہے:

میں یورپ کے اوصاف سویلزیشن کہاں تک بیان کروں۔

ان کا یہ انداز بیاں حالی کے مقدمہ شعر و شاعری سے زیادہ قریب دکھائی دیتا ہے جہاں بے جا اور نامکمل معنوی تفہیم کے ساتھ انگریزی الفاظ دکھائی دیتے ہیں۔ شاید الطاف حسین حالی نے مستقبل کے پیش نظر اردو الفاظ کی جگہ انگریزی الفاظ کا استعمال کرنا زیادہ بہتر سمجھا۔ سر سید چونکہ علی گڑھ تحریک کے روح رواں تھے لہذا ان کے انداز نگارش سے متعلقین کا متاثر ہونا لازمی امر تھا۔ جنگ آزادی کے بعد انگریزوں نے فارسی کی جگہ اردو کی ترویج کے لیے جو کوششیں شروع کیں بر صغیر پر کامل قبضے کے بعد انہیں اس بات کا احساس ہوا کہ اردو کی اسی طرح سرپرستی کرنے کی بدولت اردو فارسی کے ساتھ ساتھ انگریزی کا بھی نعم البدل ثابت ہو سکتی ہے۔ لہذٰا ابھی اردو ادب نے ترقی کی جانب اپنے سفر کا آغاز ہی کیا تھا کہ ملک میں انگریزی زبان کو زبان سرکار کا درجہ دیا گیا۔ سر سید اور دیگر کچھ مسلم رہنماؤں نے جب انگلستان کے دورے کئے تو انہوں نے انگریزی ادب اور معاشرت کے اثرات اس قدر گہرے قبول کئے کہ بجز لباس کے انہوں نے انگریزی معاشرت کے ساتھ مکمل یگانگت کا اظہار کیا۔ انگریزی الفاظ کے اردو میں در آنے کی شاید اولین وجہ یہی ہے۔ بہتر یہ ہو گا کہ انگریزی ادب کا مطالعہ کرنے کے ساتھ ساتھ اس دور میں چلنے والی انگریزی ادبی تحریکوں پر بھی

توجہ دی جائی لیکن ایسا نہ ہو سکا لہٰذا مکمل علم نہ ہونے کے سبب انگریزی کو اردو میں متعارف کروانے کی کوشش بھونڈی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> سر سید کے ادب میں حقیقت زیادہ ہے اور افسانویت functionality جو اعلیٰ ادب خصوصاً رومانی ادب میں موجود ہوتی ہے کم ہے۔ ان کے ہاں جذبات پر عقل کی کار فرمائی اور قہرمانی ہے جس کے بوجھ کے نیچے بچارے جذبات تقریباً کچل دیے گئے ہیں۔ ان کی اندرونی لہر فکر سے زیادہ عمل کی ترغیب دیتی ہے۔[۱۶]

سر سید تحریک کی بدولت اردو ادب میں ایک نیا تحول پیدا ہوا ان کے رفقاء کے علاوہ ان کے مخالفین بھی اس تحریک سے متاثر ہوئے اور مخالفت کرتے ہوئے انہوں نے غیر شعوری طور پر سر سید کا انداز بیان اور دلائل دینے کا طریقہ نقل کیا۔ سر سید کے بعد اردو ادب میں جو لہر پیدا ہوئی اس کی وجہ سے ادب بے کاری کا شغل نہیں رہا بلکہ ادیبوں میں یہ شعور بھی اجاگر ہوا کہ وہ ادب کی مدد سے معاشرے میں تبدیلی لانے کی مثبت کوشش کر سکتے ہیں۔

انگریزوں کی برصغیر آمد جہاں مغل سلطنت کے زوال کا باعث بنتی ہیں اردو ادب نے انگریزی ادب کے توسط سے نہایت تیزی سے بلندی و رفعت کی جانب سفر کیا۔ تاریخ ادب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کا نثری و نظمی ترقی کا سفر انگریزوں کی برصغیر آمد اور حکومت قائم کیے بغیر ممکن نہ تھا۔ بولی سے زبان تک کے سفر میں انگریز محققین اور زبان دانوں کا بہت ہاتھ رہا ہے۔ فورٹ ولیم کالج اور اس کے پرنسپل ڈاکٹر جون گلگرانسٹ کی خدمات نے اردو ادب کی ترقی کے سفر میں کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سر سید احمد خان اور ان کے رفقائے کار نے اردو ادب کی ترقی بالخصوص نثر کے میدان میں ترقی کے جو بلند عمارت قائم کی اس کی بنیاد فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں رکھی گئی تھی۔ ۱۷۹۹ء میں فورٹ ولیم کالج کی بنیاد کا رکھا جانا مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہ تھا۔ تاہم ناکام جنگ آزادی کے بعد فورٹ ولیم کالج کے کمزور پڑے مشن اور سر سید کی صورت میں ایک توانا آواز میسر آچکی تھی۔ سر سید نے دلائل کے استعمال سے مسلمان اکابرین اور عوام الناس کو انگریزی تعلیم کے حصول اور انگریزی ادب اور رسوم و رواج کی پیروی پر آمادہ کیا۔

سرسید انگریزی مضمون نگاروں بالخصوص بیکن سے متاثر تھا۔ ایک زوال پذیر اور ذلت کے گڑھے میں گری مسلمان قوم کو بیدار کرنے اور معاشی وسیاسی لحاظ سے اپنے پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے سرسید احمد خان دانستہ بیکن کے انداز میں مضامین لکھنے شروع ہو گئے۔ رسالہ تہذیب الاخلاق میں لکھے گئے ان مضامین میں سے بیشتر کو بیکن کے مضامین کا چربہ قرار دیا جا سکتا ہے لیکن سرسید اور بیکن کے مضامین میں موضوع کی یکسانیت کے باوجود جو دو اہم تفرقات موجود ہیں ان میں سے دو تفرقات فوری طور پر قاری کی نظر میں آتی ہیں۔ اول یہ کہ سرسید اپنی تمام تر قابلیت اور عربی، فارسی اور اردو ادب سے آگاہ تھے۔ مگر انگریزی زبان وادب میں دستگاہ کی کمزوری مضامین کے پڑھنے سے سامنے آجاتی ہے اور دوم یہ کہ بیکن اور سرسید دو مختلف تہذیبوں اور ملکوں سے تعلق رکھتے تھے۔ لہٰذا ان کے تجربات ان کا مذہب ان کی زبان اور ان کے احساسات کا ایک دوسرے سے مختلف ہونا ایک قدرتی امر ہے۔

سرسید احمد خان نے اپنے علم اور کوشش کی بنیاد پر بیکن کے مضامین کو ترجمہ کر کے مسلمان قوم کے لیے پیش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ترجمہ کرنے کے باوجود ناکام رہے۔ بیکن اور سرسید کے مضامین کا تقابلی جائزہ لینے سے جو اہم بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ بیکن اور سرسید کے مقاصد میں فرق تھا۔ بیکن نے اپنی زندگی کے تجربات نہایت سلیقے کے ساتھ انگریزی ادب میں نقل کرنے اور اسے دوسروں تک پہنچانے کے بعد ان کی زندگی کے مطالعے سے یقینی طور پر سامنے آسکتی ہے کہ بیکن کے پیش نظر اصلاح معاشرہ کا کوئی مقصد درپیش نہ تھا۔ مگر از جانب دیگر سرسید بیکن کے مضامین کے ترجمے سے اصلاح ملی و قومی کا نہایت اہم فریضہ انجام دینا چاہتے تھے۔ جس میں بڑی حد تک وہ کامیاب رہے۔ سرسید تحریک کی ناکامی کی ایک بنیادی وجہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے ادب کو صرف اور صرف مقصد تک محدود رکھنے کی کوشش کی۔ اگر وہ مقصد کے ساتھ جذبات انسانی کو بھی برابر کی نہ سہی کسی قدر بھی اہمیت دیتے تو ان کے تحریک کو اردو ادب میں تادیر سراہا جا سکتا تھا۔ لیکن ۱۸۵۷ء میں شروع ہونے والی اس تحریک نے اس صدی کے آخر میں ان کی وفات کے فوراً بعد دم توڑ دیا۔

سرسید کے تمام مضامین ان کے معروف رسالے تہذیب الاخلاق میں شائع ہوئے۔ تہذیب الاخلاق مشتہرہ مقاصد کا ادارہ بہت وسیع تھا۔ ان میں قوم کو جدید تعلیم کی طرف راغب کرنے، قومی وقار کا احساس پیدا کرنے، اردو زبان اجماعی افکار اور قومی ضروریات کا ترجمان بنانا اور مولانا حالی کے بو قل "قوم میں زندہ دلی پیدا کرنا یہی وہ اغراض ومقاصد ہیں جن کی تبلیغ وترویج کا ذمہ سرسید نے اپنے مضامین میں ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا جب ہم ان کے مضامین کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایک بات جو واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ سرسید کے خلوص میں کھوٹا پن اتنا کم تھا کہ ان کے مضامین پڑھ کر کسی قسم کی شگفتگی کا احساس نہیں گزرتا تھا۔ ہر جگہ سرسید نے ملک وقوم اور معاشرے کی سدھار کی بات کی ہے۔ گویا تہذیب الاخلاق کا اولین مقصد یہ تھا کہ قوم میں جدید سائنسی اور معاشرتی علوم کے لیے آمادگی پیدا کی جائے۔

انڈین نیشنل کانگریس کے بانی اے او ہیوم سرسید کے سائنٹیفک سوسائٹی کے سرگرم رکن تھے۔ جنھوں نے ہر جگہ سرسید اور اس کی تحریک کی زبردست حمایت کی لیکن اے او ہیوم مسلمانوں کے حالات سے سرسید کی نسبت زیادہ باخبر نہیں تھے۔ لہٰذا ۱۸۸۵ء میں جب انھوں نے ہندوستانی عوام کی اجتماعی فلاح وبہبود کے لیے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی تو ان کے پیش نظر صرف ہندوؤں کی فلاح وبہبود نہیں تھی بلکہ وہ ہندوستان کی تمام اقوام کو سیاست اور ملک کے دیگر مسائل کے حل میں یکساں مواقع دینے کے قائل تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ کئی برس پہلے سے ہندوؤں نے تعلیم کے میدان میں مسلمانوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔ اسی سبب کانگریس کو قبول کرتے ہوئے مسلمانوں کا رویہ ہندوؤں کی طرح بے تابانہ نہیں تھا۔ اس جماعت کے قیام کے بعد سرسید کا مسلمانوں کی فلاح وبہبود اور تعلیمی ترقی کے خواب کے حصول کا جذبہ مزید زیادہ وہ گیا۔ سرسید کے مضامین کے بین السطور مطالع سے معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں وقت گزرتا رہا سرسید بڑھاپے اور کمزوری کے باوجود مسلمانوں کی سیاسی اور معاشی میدان میں ترقی کے لیے مزید کوشاں ہوتے گئے۔

۱۸۹۸ء میں سرسید کی وفات کے بعد ان کے رفقائے کار نے ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ مسلم لیگ کی بنیاد رکھنے والوں میں بیشتر کا تعلق اسی مکتبہ فکر سے تھا جس کی سرسید عمر بھر ترویج کرتے رہے۔

اصلاح معاشرہ اور مسلمانوں کے معاشی وسیاسی پستی سے نکالنے کا حدف اس قدر مشکل تھا کہ سرسید کو ہندوستانی مسلمانوں کو قائل کرنے اور جدید تعلیم کی جانب متوجہ کرنے میں بلاناغہ کام کرنا پڑا۔ سرسید کے مضامین کا مطالعہ کرتے وقت ایک بات پیش نظر رہے کہ سرسید صرف اخبار اور رسائل کی ادارت کرنے اور مضامین کی نگارش ہی میں مصروف نہیں رہے بلکہ ان کی متنوع ذمہ داریوں نے ان کو وقت کی کمی کا شکار بنادیا تھا مضامین کے تحریر کرنے میں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ انہیں وقت کی قلت کے باعث خیالات کو مجتمع کرنے اور بیکن کی طرح ایک فنی شاہکار بنانے کا موقع نہیں ملا۔

سرسید احمد خان کے مضامین میں تاریخی، مذہبی اور سماجی حوالوں کی کثرت نظر آتی ہے۔ مغلیہ حکومت کے انتہائی زوال پذیر دور کا عینی شاہد ہونے کی بنا پر وہ سب نہ سہی بہت ساری ان وجوہ سے باخبر تھے جن کی بنا پر مغلیہ حکومت کو زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ سکوت دہلی کے بعد ان کے ذہن میں انگریز حکومت کی برتری کی وجوہات جاننے کا جو سوال پیدا ہوا تھا وہ یقیناً معاشرے کے بہت سارے اور لوگوں کے ذہن میں بھی موجود تھا۔ سرسید نے پہلے پہل انگریزی ادب کا مطالعہ کرنے اور نظام حکومت کو سمجھنے کی کوشش کی۔ بعد ازاں انگلستان جاکر وہاں کے نظام تعلیم کا مشاہدہ کیا اور تنقیدی نظر سے اس کا ہندوستان کے بوسیدہ نظام تعلیم سے موازنہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ بالآخر اس نتیجے پر پہنچے کہ مسلمانوں کے زوال کا بنیادی سبق تعلیم کی کمی ہی ہے۔ جس نے انہیں جدید دنیا کے ساتھ چلنے اور ہم آہنگ ہونے سے دور رکھا۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق سائینٹیفک سوسائٹی اور محمڈن اینگلو اورینٹل سکول جیسے اداروں کی مدد سے مسلمانوں کو انگلستانی تہذیب اور نظام ثقافت و تعلیم سے آگاہ کرنے کی پوری کوشش کی۔ تہذیب الاخلاق میں مضامین لکھنے کے پس پشت ان کا یہی نظریہ کار فرما تھا کہ کسی طرح مسلمانوں کو زوال کے گڑھے سے نکال کر انہیں جدید مغربی اور سائنسی علوم وہ مہارت دی جائے جو انہیں ایک دفعہ پھر اس دنیا کا طاقت ور ملک بنادیں۔ اول اول ان کے ذہن میں مذہبی مناظرت کا کوئی مسئلہ نہ تھا مگر جب ان کے ایک ملازم نے علی گڑھ کی چند کتابوں کے تراجم اردو کی بجائے دیوناگری رسم الخط میں لکھے اور ۱۸۶۷ء میں اردو ہندی تنازع کے بعد سرسید کی پوری توجہ مسلمان قوم کی فلاح وبہبود پر مرکوز ہوئی۔

انگریزی ادب اور زبان کو دو طریقوں سے اردو میں متعارف کروایا گیا۔ انگریزی زبان کو سکھانے کا طریقہ یہ تھا کہ تہذیب الاخلاق میں چند پیراگراف انگریزی زبان میں درج کیے جاتے اور بعد ازاں ان کا ترجمہ اردو زبان میں اسی صفحے پر درج کیا جاتا۔ جس کے پس منظر میں مقصد یہ رہا کہ انگریزی نئی زبان سے اجنبیت اور بے رخی کا جو رویہ مسلمان قوم میں روز اول سے پنپ رہا تھا۔ اس کو کم کیا جائے۔ دوسرا طریقہ ادب میں انگریزی اصناف کو متعارف کروانے کا تھا۔ جو سرسید ہی کے دور میں نظم، ناول اور افسانے کی صورت میں اردو میں متعارف کروایا۔ نظم کے آغاز میں فطرت نگاری اور ناول وافسانے کو متعارف کروانے والے بیشتر ادیبوں کا تعلق تحریک علی گڑھ سے تھا۔ یوں سرسید کی ہمہ جہت تحریک اردو کے فرسودہ ڈھانچے کو نئے اور خوبصورت عمارت میں بدلنے میں کامیاب رہی۔ سرسید اپنے رفقائے کار سے زیادہ اردو ادب کی اصلاح میں سب سے آگے رہے۔ مضامن کا لکھنا، اسی مرحلے کی ایک کڑی ہے۔ سرسید نے بیکن کے انداز میں مضامین لکھتے وقت اس بات کا بالکل خیال نہیں رکھا کہ وہ اردو ادب میں مضمون نویسی کے ایک نئے باب کا آغاز ثابت ہو گا۔ لیکن ان کے خلوص نے انہیں اس اعزاز سے بھی نواز دیا۔ موضوعات سے قطع نظر ان کی طرز نگارش میں قدیم ہندوستان کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ اپنی سادہ طبیعت اور صاف گوئی کے وہ مظاہر جو ان کی اپنی شخصیت کا حصہ تھے۔ مضامین میں بھی نظر آتے ہیں۔ ان کے مضامین میں حقیقت نگاری موضوع سے مخلصانہ حد تک لگاؤ اپنی رائے پر جمے رہنے کا وصف اور سنجیدگی ایسے چند نکات ہیں جو انہیں بعد میں آنے والوں کے لیے مشعل راہ کے طور پر چھوڑ گئے ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ رام بابو سکینہ، "تاریخ ادب اردو"، غضنفر اکیڈمی، کراچی، ص۴۶

۲۔ جاوید قاضی، "سرسید سے اقبال تک" انتخاب جدید پریس، اکرم آرکیڈ، ۲۹ ٹمپل روڈ، لاہور، پاکستان۔ س ن، ص۲۳۔۲۲

۳۔ حالی، الطاف حسین، "حیات جاوید"، جلد دوم، نامی پریس کانپور، ۱۹۰۱ء، ص۵۴۳۔۵۴۲

۴۔ اسماعیل پانی پتی، محمد، مولانا، مقالات سرسید، حصہ پنجم، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۹۰ء، ص۳۶۰۔۳۹۹

۵۔ ایضاً، ص۳۴۰

۶۔ ایضاً، ص۱۴۰

۷۔ ایضاً، ص۳۴۵

۸۔ ایضاً، ص۱۶۳

۹۔ ایضاً، ص۳۳۴

۱۰۔ ایضاً، ص۲۵

۱۱۔ اسماعیل پانی پتی، محمد، مولانا، مقالات سرسید، حصہ ہشتم، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۹۱ء، ص۱۸۴

۱۲۔ ایضاً، ص۹

۱۳۔ الطاف حسین حالی، مولانا، حیات جاوید، ھجرہ انٹرنیشنل پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۴ء، ص۳۲۰

۱۴۔ ایضاً، ص۱

۱۵۔ الطاف حسین حالی، مولانا، اسلوب نثر کا ارتقا، ھجرہ انٹرنیشنل پبلشرز، لاہور، طبع اول، ۱۹۷۹ء، ص۲۳۹

۱۶۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر، سرسید احمد خان اور ان کے رفقائے کار کا حصہ، مکتبہ کاروان، لاہور، طبع اول، ۱۹۶۰ء، ص۲۹۰

باب سوم:

فرانسز بیکن کے منتخب مضامین کا جائزہ

تعارف:

فرانسز بیکن ۲۲ جنوری ۱۵۶۱ء کو برطانیہ کے ایک نامور گھرانے میں پیدا ہوا جو کہ برطانیہ کے ایک شہر سٹرینڈف ورڈ میں واقع ہے۔ اس کے والد کا نام یفکولس بیکن تھا جو کہ شاہی مہر میں ملازمت کرتا تھا۔ اس کی ماں کا نام این کوکی تھا اور بھائی کا نام اینتھنی بیکن تھا۔

فرانسز بیکن ایک روایتی انگریزی فلاسفر، سائنسدان، مصنف اور سائنسی ایجادات کا باپ بھی کہا جاتا تھا۔ سائنسی طرز فکر میں وہ سب فلاسفروں میں سے اولین درجہ رکھتا تھا۔ یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جدید سائنسی طرز فکر کا بانی بیکن ہی تھا۔ اس نے برطانیہ کے لارڈ چانسلر کے ساتھ ساتھ اٹارنی جنرل کے فرائض بھی انجام دیئے۔ اس کی ماں ایک انسان دوست شخص (humanist) کی بیٹی تھی۔ سب خاندان والوں کا خیال تھا کہ بیکن گھر میں ہی ابتدائی تعلیم حاصل کرے کیونکہ بچپن میں بیکن کی صحت خاصی خراب رہتی تھی۔ بیکن نے پیورٹیں ہونے کی وجہ سے بنیادی تعلیم جون والسول سے حاصل کی جبکہ آکسفورڈ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھا۔ ۱۵ اپریل ۱۵۷۳ کو بیکن نے ٹرینیٹی کالج میں داخلہ لیا اس وقت بیکن کی عمر تقریباً ۱۲ سال تھی۔ وہ یہاں تین سال تک بڑے بھائی کے پاس رہا۔

بیکن کو بنیادی تعلیمات میں سب سے پہلے یا زیادہ لاطینی زبان سکھائی گئی۔ اس کے بعد پوئٹیئرز یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے گیا۔ وہاں کیمبرج میں اس کی ملاقات ملکہ الزبتھ سے ہوئی جو کہ اس کی ذہانت سے خاصی متاثر ہوئی اور اسے ''چھوٹے لارڈ کسپیر'' کا خطاب بھی دیا۔ بیکن کی تعلیم نے اسے یہ علم سکھایا کہ جو عقیدے یا علم وہ پہلے سیکھتا رہا وہ تو بالکل غلط تھے یا جو سائنسی معلومات تھی وہ بالکل بے بنیاد تھیں۔ وہ ارسطو کے نظریے سے بھی بالکل مخالفت رکھتا تھا۔ اس کے مطابق ارسطو کا فلسفہ غیر نفع بخش ہے۔ بحث پر

مبنی اور مقاصد کے لحاظ سے درست نہیں ہے۔ کچھ دنوں کے بعد ۱۵۷۶ میں وہ اپنے بھائی کے ہمراہ پیرس منتقل ہو گیا۔

فرانس میں ہنیری سوم کی حکومت کو قیمتی سیاسی مشورے اور ہدایات دینے کے سبب اس نے حکومتی حلقوں میں خاصا اثر ورسوخ حاصل کیا۔ بیکن نے سپین، اٹلی اور دیگر ممالک کا سفر کیا، اس نے حکومتی ذمہ داریاں اور سول قانون کی ذمہ داریاں اور سفارتی اہداف معمول کے مطابق حاصل کیے اور زبانوں کے متعلق بھی علم حاصل کرنے کی کوشش کی۔

۱۵۷۹ء میں والدہ کی اچانک وفات کے بعد وہ فوری طور پر برطانیہ منتقل ہو گیا۔ سر نیکولس بیکن نے اپنے چھوٹے بیٹے کے لیے معقول رقم جمع کی تھی تاکہ ان کے لیے زمین خریدلی جاسکے تاہم اس سے پہلے ہی ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔

بیکن کے پیش نظر جو بڑے بڑے مقاصد رہے ان میں تین مقاصد زیادہ اہمیت کے حامل ہیں:

۱۔ سچ کو آشکار کرنا

۲۔ ملک کی خدمت

۳۔ مذہب کی خدمت

بیکن اس طرح کی باوقار اور نجی منصب کا متلاشی تھا۔ جس کی مدد سے وہ ان تین مقاصد کو بہ حسن وخوبی حاصل کر سکے۔ اسی مقصد کے پیش نظر اپنے ایک uncle کی وساطت سے اس نے ایک اونچے عہدے کے لیے عدالت سے رجوع کیا۔ لارڈ برگلے کے متعلق ان کا یقین یہ تھا کہ وہ اس منصب کے لیے ان کی درخواست قبول کرلیں گے لیکن اس کے برعکس ان کی درخواست مسترد کر دی گئی۔ آئندہ آنے والے دو برسوں میں اس نے Grays Inn میں کام کرنا جاری رکھا تاکہ وکیل کی حیثیت سے داخلہ لے سکے۔ پارلیمنٹ کے ممبر کی حیثیت سے ۱۵۸۴ء میں ایک سیٹ حاصل کرلی۔ یہ وقت تھا جب بیکن مذہبی جماعتوں کی

شرائط کے اوپر لکھنا شروع کیا۔ ان کا دوسرا اہم عنوان فلسفیانہ اصلاحات تھا۔ ان کی تصنیف Temperis Partus Maximus اس سلسلے میں ایک اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

ایک مدت دراز تک کام کرنے کے باوجود بیکن ایسے کلیدی منصب کو پانے میں کامیاب نہ ہو سکا جس کی مدد سے مزید کامیابیاں حاصل کر سکتا۔ اس نے اپنی والدہ کو Waltes Trauers کا ساتھ دینے کے لیے کہا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی پہلی تصنیف کو Puritan فرقے کی جانب سے تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔

بعد کی زندگی:

فرانسز بیکن نے ملکہ الزبتھ کے قریبی ساتھی اور) Essex ریاست) کے نواب Robert Deveruex کی ہم نشینی اختیار کر لی۔ نتیجتاً ۱۵۹۱ء میں وہ Essex کے نواب کا خفیہ مشاور مقرر ہوا۔ اسی سال بیکن کو اجازت ملی کہ وہ Robert Parson کی حکومت مخالف بیانات کو رد کرنے کے لیے لکھے۔

رفتہ رفتہ ان کی شہرت شاہی اور اشرفیہ کے حلقوں میں بڑھ گئی۔ بنیادی طور پر اس کا باپ شاہی مہر سے تعلق ضرور رکھتا تھا لیکن اسے اشرافیہ میں نہیں گنا جا سکتا تھا۔ سپین کے ساتھ جنگ کے لیے حکومت کو زرِ کثیر کی ضرورت تھی اور ارادہ یہ تھا کہ وہ آدھی مدت کے دوران تین گنا سے زیادہ ٹیکس اکٹھا کر سکیں لیکن بحیثیت رکن پارلیمان بیکن نے مجوزہ حکومتی منصوبے کی سخت مخالفت کی اور بل منظور نہ ہو سکا۔ بیکن کے مخالفین کے مطابق ان کا یہ عمل سستی شہرت حاصل کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ ان کی سیاسی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب دربار شاہی میں ان کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ ٹیکس جمع کرنے میں ناکامی کا سبب بننے پر ملکہ وکٹوریہ نے بیکن کے طرز عمل کا بہت برا منایا اور اس وجہ سے بیکن کے اٹارنی جنرل اور سولیسٹر جنرل جیسے اعلیٰ ترین عہدوں پر تفویض ہونے کے امکانات ختم ہو گئے۔ ان کے اس عمل پر ملکہ اتنی زیادہ ناراض تھی کہ چار برس تک اس کی صورت دیکھنا گوارہ نہ کیا۔

Essex نے ان کو اٹارنی جنرل کا عہدہ واپس دلانے کی کوشش کی لیکن ناکامی ہاتھ آئی۔ ان کی دلجوئی کے لیے Essex نے پراپرٹی کا کچھ حصہ بیکن کے نام کر دیا جو بیکن نے جلد ہی ۱۸۰۰ پاؤنڈ میں فروخت کر دیا۔ ۱۵۹۵ء میں بیکن نے ایک دفعہ پھر قسمت آزمائی کی مگر ان کے نام کو نظر انداز کر دیا گیا اور ان کی بجائے

Flemingنامی ایک شخص کو سولسٹر جنرل بنادیا گیا تاہم یہ ضرور ہوا کہ اب کی بار ملکہ نے ان کے دربار آمد پر پابندی ختم کر دی۔ ۱۵۹۸ء میں قرض واپس نہ کرنے پر بیکن کو گرفتار بھی کیا گیا۔ جب بیکن کو دونوں اعلیٰ سرکاری عہدوں پر کامیابی حاصل نہ ہوئی تو ان کا رخ قانونی پیسے اور دیگر سرگرمیوں کی طرف ہو گیا۔ گزر اوقات کے لیے بیکن نے Grays Ims میں لیکچر دینا شروع کر دیئے۔ اس وقت تک بیکن نے اپنے خیالات اور نظریات کو تحریری صورت میں لانا شروع کر دیا تھا۔ ان کا مضامین کا مجموعہ ۱۸۹۷ء میں شاءع ہوا۔ ۱۸۹۸ء میں ملکہ کی نگاہوں میں بیکن کی ساکھ دوبارہ بحال ہونے لگی اور تب تک ملکہ نے سرکاری کاموں کی انجام دہی کے لیے ایک اچھے مشاور کے طور پر انہیں بلانا شروع کر دیا۔ تاہم انہیں کوئی عہدہ دیا گیا نہ ہی انہیں تنخواہ دی گئی۔ آہستہ آہستہ وہ ملکہ کے پہلے سے بھی زیادہ قریب ہو گیا۔ سپین اور آئرلینڈ کی جنگوں میں برقی کارکردگی دکھانے پر معاملات کو سدھارنے کے لیے بیکن نے بہت کچھ کیا لیکن ان کے عمل سے دونوں اطراف کے لوگ خوش دکھائی نہ دیئے۔ بیکن اور ملکہ کے تعلقات میں قربت اس وقت مزید بڑھ گئی جب اس نے بغاوت کے مقدمات کی تحقیقات کے لیے انہیں مقرر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ بیکن نے ناشکرے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے پرانے محسن Essex کے خلاف مقدمہ مضبوط کرنے کے لیے کافی زور لگایا جب Essex نے اس عمل کے خلاف بغاوت کی ناکام کوشش کی تو بیکن نے اسے غدار قرار دے دیا اور اس کے خلاف سرکاری رپورٹ بھی تحریر کی۔ اس کے باوجود خود ملکہ نے بیکن کو کوئی مستقل سرکاری عہدہ نہیں دیا۔ ۱۶۰۳ء میں ملکہ الزبتھ کے انتقال کے بعد James اول برسراقتدار آیا تو بیکن کی قسمت کھل گئی۔ اسی سال بادشاہ نے Knight بنایا جب Essex زندہ تھا تو اس نے جیمز کے بادشاہ بننے کی حمایت کی تھی۔ لہٰذا حالات کے پلٹنے پر بادشاہ کو خوش کرنے کے لیے اپنے پہلے رویے پر معذرت آمیز تحریر (Apology) تحریر کی۔ بادشاہ کی پہلی پارلیمنٹ کے لیے بیکن Saint Albax سے رکن منتخب ہوا اور سکاٹ لینڈ کے انگلینڈ کے ساتھ سیاسی الحاق کے لیے بنائی گئی یونین میں بطور کمشنر اسے بھی شامل کیا گیا۔ اسی سلسلے میں بیکن کی جانب سے کی گئی قابل لحاظ کوششوں کو بادشاہ نے خوب سراہا۔ ۱۶۰۴ء میں بادشاہ نے اسے اپنا مشیر فرار کر دیا۔ اگلے سال یعنی ۱۶۰۵ء میں بیکن نے اپنا مشہور مضمون Advancement of Learning شائع کروایا۔ مذکورہ مضمون میں بادشاہ کی بہت زیادہ خوشامد کی گئی تھی۔ ۴۵ برس کی عمر میں بیکن نے لندن کے ایک تاجر کی بیٹی سے شادی کر لی۔ ان کی شادی

شدہ زندگی کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں لیکن بیکن نے اپنی آخری وصیت میں اپنی بیوی کو عاق کر دیا۔ ۱۶۰۷ء میں بیکن کو سوئسئر جنرل کی پوسٹ پر فائز کر دیا گیا۔ ۱۶۰۸ء میں سٹار چیمبر کی کلرک شپ مل گئی۔ اس کی آمدنی بہت اچھی تھی لیکن پرانے قرضوں اور شاہ خرچیوں کی وجہ سے وہ مقروض رہا۔ زیادہ بڑا عہدہ اور دولت کے حصول کے لیے وہ جیمز اول کی ظالمانہ پالیسیوں کی حمایت کرتا رہا۔ ۱۶۰۸ء میں وہ لارڈ چانسلر کی پوسٹ پر فائز ہو گیا اور اسی سال اسے Baron بنا دیا گیا۔

۱۶۲۰ء میں Noum Orgonun کی تحریر بیکن کے لیے سائنسی اور نظریاتی فکر کی ایک نئی جہت ثابت ہوئی۔ جس میں بیکن نے عوام کو بتایا کہ ارسطو کے پرانے نظریات کو غلط قرار دیں اور نئے سائنسی فکر و تخیل اور فلسفے پر غور کریں۔ چناچہ اسی صورت حال کے پیش نظر اسے ۱۶۲۱ء میں سینٹ الیان کا وائی کاؤنٹ (Viscount) بنا دیا گیا۔

بیکن اپنی غیر معمولی ذہانت کے باعث بہت اعلیٰ سرکاری عہدوں پر مقرر رہا۔ چونکہ اسے قانون دانی اور سیاست دانی کا ماہر تسلیم کیا جانے لگا تھا۔ جس کے باعث لوگوں کے دل میں اس کے لیے بغض جمع ہونا شروع ہو گیا اور بہت سے افراد نے اس پر الزام تراشی بھی کی کہ بیکن رشوت خوری کا عادی ہے۔ سر جون چرچل کو بیکن نے کام سے کئی بار برطرف کیا۔ اس نے اسی بات کو بنیاد بنا کر کمیٹی کو کچھ ثبوت فراہم کیے جو بیکن پر لگے کرپشن کے الزام کو درست ثابت کرتے تھے۔ اس کے بعد کرسٹوفر آبری نے House of Commons میں سب کے سامنے بیکن کو رشوت خور انسان کہا۔ بیکن کے دشمن اسے اس اعلیٰ عہدے پر دیکھنا گوارہ نہیں کر رہے تھے۔ اس لیے انھوں نے الزام تراشی شروع کر دی جس کے بعد بیکن شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہو گیا۔ کیونکہ اس کے مطبع اب اسے دونوں معاملات میں یعنی (سیاست اور عدالت) میں بدعنوان سمجھ رہے تھے۔ دراصل یہ سارا واقعہ اس دور کے رواج کی وجہ سے درپیش آیا کیونکہ بطور جج (منصب) مقدمہ جیتنے والے اراکین نے بیکن کو بطور مصنف بہت سے انعام و کرام دیئے۔ بیکن نے اپنے اوپر لگے الزامات کو غلط ثابت کرنے کی بجائے اس بات کا کھلے دل سے اعتراف کر لیا کہ اس نے انعامات لیے۔ اسی وجہ سے اس پر جرم ثابت ہو گیا اور بیکن نے ۴۰۰۰۰ پاؤنڈ کی رقم بطور جرمانہ حکومت کو ادا کی، اور اس کے بعد اسے قید بھی کر

دیا گیا۔ اسے جتنے بھی خطابات سے نوازا گیا تھا۔ سب اس سے چھین لیے گئے۔ ان سب باتوں کے بعد الزام اسے ٹھیک چار دن کے بعد آزادی حاصل ہو گئی اور سارا جرمانہ معاف ہو گیا لیکن اسے ملکی معاملات میں وہ مقام و مرتبہ بھی حاصل نہ ہو سکا۔ کچھ لوگوں کے مطابق میں وہ مقام و مرتبہ بھی حاصل نہ ہو سکا۔ کچھ لوگوں کے مطابق بیکن کے خلاف یہ ساری کاروائی سوچی سمجھی حکمت عملی معلوم ہوتی ہے تاکہ یہ اپنی غیر معمولی ذہانت کے باعث کسی بھی سیاسی فریق کو پھنسا نہ سکے۔

بیکن کے لیے یہ ساری بات بہت تکلیف کا باعث بنی۔ وہ ان سب معاملات کو ترک کر کے زمینوں کا رخ اختیار کر گیا۔ اسی دوران اس نے ادب پڑھا اور اس نے ادب کے میدان میں اپنے جھنڈے گاڑھے اور ایک بار پھر وہ اپنی ایک نئی جہت کے ساتھ دنیا کے سامنے جلوہ افروز ہوا اور ایک اندازے کے مطابق بیکن کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ اس کی ادبی تحریریں ہی ثابت ہوئیں۔

بیکن کا ادبی اور سیاسی و معاشرتی سفر:

بیکن انگریزی ادب میں مضمون نگاری کی وجہ سے ایک بہت بڑے مرتبے کا حامل ہے۔ لیکن ادب میں موجود مستقل حیثیت پانے والے ان کے مضامین جن ارشادات عالیہ یا اخلایات کا اظہار کیا گیا ہے اس کی عملی زندگی میں اس کا ہلکا سا سایہ بھی نظر نہیں آتا۔ ایک طویل سیاسی زندگی میں اس کی ملاقات ہر طرح کے لوگوں سے ہوئی جس نے بیکن کے ذہنی اور نفسیاتی صلاحیتوں میں اضافہ کیا۔ ایک چالاک اور زمانہ ساز شخصیت ہونے کی وجہ سے وہ انسانی کمزوریوں سے بہت اچھی طرح واقف اور ان کمزوریوں کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لیے اس کے پاس ذہن ایسا موجود تھا۔ یہ بات اہم ہے کہ ان کی سیاسی زندگی نشیب و فراز سے بھرپور رہی اور آخر کار اس زندگی سے چھٹکارا حاصل کر کے بیکن نے اپنی عمر عزیز کے آخری ایام میں گاؤں میں گزارے۔ آج سیاسی زندگی میں بیکن کا کوئی حوالہ کبھی نہیں دیا جاتا مگر دیہات میں گزارے گئے آخری ایام جس میں اس نے ادب کا کام کیا اس کے لیے حیات جاوید اں کے لیے ایک سبب ثابت ہوئی۔ جیسا کہ ابتدا میں ذکر کیا گیا کہ بیکن نے شاہی خاندان میں مستقل حیثیت کے حصول اور ذاتی فائدے کے لیے ہر قسم کا اخلاقی اور غیر اخلاقی حربہ استعمال کیا لیکن بہت زیادہ کامیابیوں کے باوجود وہ ہمیشہ ایک ایسے شخص کے روپ میں زیادہ

نمایاں ہوتا ہے جس نے سیاسی زندگی میں کامیابیوں سے زیادہ ناکامی حاصل کی۔ برطانوی قانون میں پائے جانے والے قسم بیکن کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھے۔ لہٰذا حصول زر کے لیے غلط مشورے دینے اور جلد فائدہ حاصل کرنے کے لیے اخلاقیات کے مروجہ ضابطے کو بالائے طاق رکھنے کی کوشش کرنے کے لیے لوگوں کو راغب کرنا اس کی وکالت کی زندگی کا بدترین حصہ ہے۔ وہ زندگی کے آخری ایام میں جب لندن سے اپنے گاؤں منتقل ہوا تو اس نے وہاں اپنے تجربات اور سائنسی طرز فکر کی بنیاد پر لکھے جانے والے مضامین کی بنیاد پر بہت بڑی کامیابی حاصل کی۔

ان کے مضامین میں سب سے اہم خصوصیت انسانی رویوں پر بیکن کے مفصل تبصرے ان کی انسانی عادات اور خصوصیات پر کامل دسترس کا پتہ بتاتے ہیں۔ بیکن نے ارسطو اور افلاطون اور دیگر یونانی مفکرین کے مسلسل مطالعے سے ان میں موجود خامیوں کو کھنگال ڈالا اور اس کے بعد اپنی فلاسفی میں ان کی نفی کی ہے۔ دراصل ان کے فلسفے کی بنیاد سائنسی اور منطقی ہے۔ لہٰذا اس میں جذباتیت یا سطحیت کا کوئی گزر نہیں۔ بیکن ہمیشہ سے انگریز معاشرے کا سب سے بڑا نقاد رہا مگر خود بھی ایسے ہی معاشرے کا طالب رہا جہاں ذاتی صلاحیتوں کے بل بوتے پر دوسرے لوگوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے اپنے مقاصد کے حصول کو ممکن بنایا جاسکتا۔

بیکن کی تحریروں کی ایک اہم خصوصیت خشوزوائد سے پاک ہونا ہے جس نے بیکن کو دیگر مضمون نگاروں کے لیے بطور مثال کھڑا کیا ہے۔ ان کے مضامین دوسرے مضمون نگاروں سے موازنہ کر کے نتائج اخذ کیے جاتے ہیں۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی مضمون نگاری میں چند خصوصیات جو عموماً دیگر مضمون نگاروں کے ہاں ناپید ہیں وہ یہ کہ بیکن بہترین علمی وادبی زبان کا مضمون نگاری میں استعمال لازم سمجھتا ہے۔ ادب سے شغف نہ رکھنے والے لوگوں کے لیے ان کی باتوں کو سمجھنا ممکن نہیں۔ مثالوں سے وضاحت ان کی تحریر کی پختگی اور دلائل کی طاقت ہے۔

فرانسز بیکن کے مضامین کا فکری جائزہ:

فرانسز بیکن کے مضامین فکری و فنی لحاظ سے اس قدر خوبصورت اور بے داغ ہیں کہ انہیں بلا مبالغہ فنی ادب کے کسی بھی فن پارے کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔ ہر قسم کے خشو و زوائد سے مبرا ان مضامین میں لوک دانش کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

فرانسز بیکن کے کچھ مضامین تو بین الاقوامی سطح پر شہرت کما چکے ہیں۔ ہر چند بیکن نے اپنی زندگی اور کیریئر کی کی شروعات یا یوں کہیے کہ بلند ترین مرتبے کے حصول کے لیے دوسروں کے سر پر پاؤں رکھنے سے گریز نہیں کیا لیکن ان کے مضامین میں اس قسم کی کوئی خصوصیت دکھائی نہیں دیتی۔ بیکن ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور جہان دیدہ شخص تھا۔ ہمیشہ بادشاہ کی قربت یا زیر عتاب رہا مگر اس کے مضامین اس کی گہری سوچ اور دانائی کے غماض ہیں۔ فرانسز بیکن عیسائی مذہب کے بارے میں قابل قدر معلومات رکھتا تھا۔ لہٰذا اپنے مضامین میں انجیل کے حوالہ جات بکثرت دیئے لیکن ان حوالوں کے باوجود اس کی تحریر گراں قدر محسوس نہیں ہوتی بلکہ یہ حوالے اس قدر مبنی بر واقعہ ہوتے ہیں کہ اگر ان حوالوں کو نکال دیا جائے تو تحریر کی چاشنی ختم ہو کر رہ جائے لیکن انجیل کے ان حوالوں سے ہم ہرگز اندازہ نہیں کر سکتے کہ بیکن کے مضامین مذہب کی تبلیغ کے ضمن میں اپنی بات کو وقعت دینے کے لیے ہیں۔ اس کے باوجود جب ہم ان کے مضامین کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ بیکن نے انسانی نفسیات، خواب، توقعات اور ضروریات کو مد نظر رکھتے ہوئے ایسے نکات پر بحث کی ہے جن کو ہم عمومی زندگی میں اہمیت نہیں دیتے۔ مگر عملی زندگی میں بہر طور ان کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

مضامین بیکن کے مطالعہ سے پہلے پہل یہ احساس ابھرتا ہے کہ لکھنے والا زندگی کو عام نظر سے دیکھنے کی بجائے فلسفیانہ انداز فکر اختیار کیے ہوئے ہے۔ فلسفے کے ساتھ ساتھ اہم سے اہم مسئلے کو کم سے کم الفاظ میں بیان کرنا بیکن کی خصوصیت ہے۔ بیکن کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ وہ سادہ زبان استعمال کرتا ہے اور نہ ہی سادہ خیال پیش کرتا ہے۔ اس کے باوجود قارئین کو مسحور کر دیتا ہے۔

بیکن کے انداز تحریر میں بعد میں آنے والے متعدد مضمون نگاروں اور انشائیہ نویسوں کو اس بات کی ترغیب دی کہ اچھے طریقے سے مضمون لکھنے کے لیے کون سے لوازم زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ہم بیکن کو اچھی مضمون نویسی کے لیے ایک Trend Settar کے درجے پر فائز کر سکتے ہیں۔ الفاظ کے بہتر استعمال اور دلیلوں کی بہم فراہمی نے مضمون نگاری کے میدان میں بیکن کو وہ مقام و مرتبہ دیا جس پر اس سے پہلے کوئی موجود نہیں تھا۔ ان کے جملے لمبے لمبے ایک دوسرے سے منسلک اور خیالات کی ترتیب میں اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ بات حیران کن ہے کہ بیکن سے پہلے مضمون نگاری کے فن کو انگریزی ادب میں درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا اور نہ ہی خیالات کے اظہار کے لیے اس سے کام لینے پر اچھا سمجھا جاتا تھا مگر بیکن نے اس گری پڑی صنف میں صحیح معنوں میں روح ڈالنے میں اہم کردار ادا کیا۔

بیکن عوامی انسان نہیں تھا بلکہ اس کی کوشش اپنی تمام تر زندگی میں یہی رہی کہ وہ کسی خاص مقام تک پہنچ سکے۔ اپنی جدوجہد میں بیکن نے ہر قسم کے قانونی، غیر قانونی، اخلاقی و غیر اخلاقی ہتھکنڈے استعمال کیے اور بالآخر وہ اپنے مقصد کو پانے میں کامیاب ہوئے مگر غیر معمولی اخراجات اور شاہانہ طرز زندگی نے اس کی زندگی میں زہر گھول دیا اور وفات کے وقت وہ قابل قدر آمدنی ہونے کے باوجود قرضدار ہو کر مرا۔ قانون کی تعلیم نے بیکن کو انسانی نفسیات سمجھنے میں مدد فراہم کی۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اس کی تحریریں مطالعہ کرتے ہیں تو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ بیکن نے انسانی نفسیات، انسان کی کمزوریوں اور اس کی مثبت پہلوؤں کا کتنی نزدیکی اور باریک بینی سے مطالعہ کیا۔ انسانی نفسیات کا گہرا مطالعہ و مشاہدہ بیکن کے مضامین کو دو طرح سے بہت زیادہ متاثر کرتا ہے۔ اور یہ کہ بیکن نے علم برائے افادہ کے اصول کے تحت تمام عمر مطالعہ میں صرف کیا اور اس افادے کو انسانی نفسیات کے گہرے مطالعے کی وجہ سے دلائل کو زیادہ بہتر استعمال کیا۔ دوم یہ کہ اس کے مطالعے نے اسے انتہا پسندی کے بجائے میانہ روی پر مائل کیا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اس سے قبل اس قسم کی کاوش کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس کے باوجود بیکن کے مضامین اس قدر بھرپور خوبصورت اور متوازن ہیں کہ بعد میں آنے والے متعدد مضمون نگاروں کے مضامین اس کے مقابلے میں کم تر درجے کے نظر آتے ہیں۔(۸) عموماً ادب میں یہ دیکھا گیا ہے کہ پہلے کم تر درجے کا ادب منظر عام پر آتا ہے جسے بعد میں آنے

والے ادیب اپنے تجربات اور ذہنی صلاحیتوں کی بنیاد پر بہتر سے بہتر درجے پر فائز کر دیتے ہیں۔ لیکن مضمون نگاری میں بیکن کا کمال یہ ہے کہ اس کے بعد آنے والے مضمون نگار یقینا اچھے اور قابل قدر ہیں۔ مگر توازن، خوبصورتی اور تنوع جو امتزاج بیکن کے مضامین میں ملتا ہے وہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔ اس لیے یہ بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ بیکن کے مضامین میں خوبصورتی لانے والی خصوصیات میں توازن اور جملہ بندی میں بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔

بیکن کے مضامین کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ بیکن نے خیالی اور ماورائی کہانیوں کے بجائے حقیقت پسندانہ رویہ اختیار کیا۔ بیکن کی تحریر کو یاوا گوئی یا فضول باتوں کی کوئی جگہ نہیں۔ اس کے باوجود تحریر میں دلچسپی کا عنصر کم نہیں ہو پاتا۔ معلومات کا ذخیرہ جو بیکن کے پاس ہے بیکن کی تحریر میں بوقت ضرورت ہی دکھائی دیتا ہے۔ بیکن نے عالمانہ روش اختیار کرنے کے باوجود اپنی تحریر گراں بار ہونے نہیں دیا بلکہ معلومات اور علمی بحثوں کو اپنی خوبصورتی سے سمیٹا ہے کہ کسی قسم کے تصنع کا شائبہ نہیں گزرتا۔ ان کے مضامین میں لمبی لمبی بحثوں کی بجائے مختصر اور جامع انداز اختیار کیا گیا ہے۔ بیکن کا زمانہ سائنسی اختراعات اور عقل پر مبنی خیالات کو تحسین کی نظر سے دیکھے جانے کا زمانہ تھا۔ لہٰذا بیکن نے مذہبی بالخصوص انجیل سے دی گئی مثالوں میں دنیاوی مفاد کو پیش نظر رکھا ہے۔ مذہب سے متعلق مثال دیتے ہوئے بیکن کا لہجہ قطعی غیر جذباتی ہوتا ہے۔ انھوں نے مذہب کو استعمال کرتے ہوئے لوگوں کے جذبات کو برانگیختہ کرنے سے گریز کیا ہے۔ مذہبی مثال ان کے ہاں دانش اور کلی سچائی کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ ایسی سچائی جس سے انکار کسی صورت ممکن نہیں ہوتا۔ بیکن نے مذہب کے علاوہ ادب اور تاریخ کی مثالیں دی ہیں۔ لیکن وہ عمومی باتوں اور جذبوں سے مثالیں دینے میں زیادہ خوشی محسوس کرتے ہیں۔ یہ ایک عجیب طرح کا رویہ ہے جس کی توجیہ ان کی مشکل پسندی کے باعث ممکن نہیں۔ ایک طرف وہ عمومی زندگی اور رویوں کو موضوع بحث بنا کر بہت خاص درجے تک پہنچا دیتے ہیں اور اسی سے متعلق مثالیں بھی ڈھونڈ کر لاتے ہیں مگر دوسری جانب مشکل اور عالمانہ زبان کے استعمال سے ان کی کوشش بظاہر یہ نظر آتی ہے کہ ان کی زبان عام لوگوں کے فہم وادراک سے باہر اور اعلیٰ ہے۔ اس رویے کی ایک عمومی توجیہ یہ بھی بیان کی جا سکتی ہے کہ وہ تمام عمر شاہی خاندان کی

قربت اور اعلیٰ عہدوں پر براجمان ہونے کے خواہش مند رہے۔ اسی وجہ سے انھوں نے طبقہ اولیٰ اور اشرافیہ کو انتہائی نیچ اور گھٹیا حرکات کرتے دیکھا۔ وہ کسی طور بھی ان کے عہدے اور قابلیت و خاندان سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ اپنی تحریروں کے ذریعے زندگی کے عمومی رویوں کو مثال بنا کر وہ طبقہ اشرافیہ کو ایک ایسا راستہ دکھانا چاہتے ہیں تاکہ بعد میں ان کے لیے زیادہ مشکل پیدا نہ ہو اور وہ اپنے رویوں میں بہتری اور اصلاح پیدا کر کے اپنے آپ کو عوامی خدمت کے لیے وقف کر سکیں۔

بیکن کے مضامین اشرافیہ کو راستہ دکھانے کے لیے ہی وقف نہیں بلکہ عمومی زندگی گزارنے والے لوگ بھی اس میں موجود دانش کی باتوں کو اپنے لیے مشعل راہ بنا سکتے ہیں۔ اپنی تحریر، تقریر اور مثالیں بیان کرنے میں بیکن کا رویہ اعتدال پسندانہ اور خوش کن ہے۔ اعتدال پسندی ان کے مضامین میں بڑی دیر کے بعد آئی جب انتہائی مشکل الفاظ سے گریز کر کے نسبتاً آسان اور رواں الفاظ میں بیکن نے مضامین تحریر کیے۔ بیکن کے بعض مضامین میں وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ یہ بات اس لیے اہم ہے کہ بیکن ادب برائے افادہ کے ساتھ ساتھ ادب برائے ادب کے نظریے پر پختہ یقین رکھتا ہے۔ زندگی کے عمومی مسائل جب بیکن کی زبان سے بیان ہوتے ہیں تو وہ عمومیت کی بجائے خصوصیت کے حامل ہو جاتے ہیں۔ بیکن نے اپنے مضامین کو تحریر کرتے ہوئے جن امور کو قابل لحاظ اہمیت دی ان میں زبان و بیان، محاورات کا استعمال، مذہب اور معاشرت سے مثالیں، گری پڑی اور بازاری زبان کی وجہ سے مہذبانہ زبان کا استعمال بیکن کو باقی تمام مضمون نگاروں سے ممتاز کرتا ہے۔

بیکن کے مضامین مرصع نثر، رواں اسلوب، زندگی کی حقیقی اور غیر جذباتی تصویر کا ایسا نمونہ ہے جو انگریزی ادب کے علاوہ دنیا کے دیگر ادبیات میں بمشکل نظر آتا ہے۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ بیکن نے اپنی بلند فکری سے ادب کے ایسے شاہکار تخلیق کیے ہیں جن کی نظیر بعد میں کہیں نظر نہیں آتی۔ اگرچہ یہ مضامین عقلی بنیادوں پر تفہیم و تقسیم کرتے ہیں مگر باوجود کوشش کے بعد میں آنے والے مضمون نگاروں میں سے کوئی بھی بیکن کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا اور یہ بیکن کے مضامین کی فکری عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

:Of Ambition

بیکن کے گہری فکری ونفسیاتی جائزے کا شاہکار مضمون ہے۔ بیکن عملی زندگی میں مادی فوائد کے حصول اور بڑے عہدوں تک رسائی میں مصروف رہا۔ اپنی تعلیم مصروفیات اور تعلقات کی بنا پر انسانی نفسیات کے بارے میں اس کے گہرے تجزیے کو رد کرنا ایک نہایت مشکل کام تھا۔ میکیاولوی کی مانند وہ ہر جذبے اور خواہش کے مادی فائدے کو خاص طور پر مد نظر رکھتا۔ Of Ambition ایسے افراد کے بارے میں لکھا گیا ہے جو مادی فوائد یا کسی بلند مقصد وعہدے کے حصول کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہوں۔ ایک طویل عرصے تک شاہی خاندان سے وابستگی بیکن کی پیشہ وارانہ زندگی کا طرہ امتیاز ہے۔ اس لیے اپنے بیشتر مضامین میں وہ بادشاہ کو مشورہ دیئے بغیر نہیں رہتا۔ بنیادی طور پر وہ جمہوریت کی بجائے مطلق العنائیت پر یقین رکھتا ہے۔ نظام شاہی کے بارے میں اس کی پسندیدگی کسی شک وشبہ سے بالاتر ہے۔ اس مضمون میں بیکن نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح شدید جذبے رکھنے والے انسانوں کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بیکن جس طرح مضمون نگاری میں منطق اور میانہ روی کو اختیار کرتا ہے اسی طرح سائنسی انداز میں لگی لپٹی رکھے بغیر اپنی سوچ کو آشکار کرتا ہے۔ کہیں کہیں نہ چاہتے ہوئے بھی بیکن کے انداز فکر سے خود غرضی اور مطلب پرستی ٹپک پڑتی ہے۔ جیسے کہ وہ محترک اور سبک رفتار انسانوں کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے یہ نظریہ پیش کرتا ہے کہ اس طرح کے لوگوں کو اپنے مستقبل کے بارے میں ہمیشہ شش وپنج اور گومگو کی کیفیت سے دوچار رکھنا چاہیے تاکہ مستقبل میں وہ کسی خطرے کا باعث نہ بن سکیں۔ بیکن یہ تجویز دیتا ہے کہ شدید جذبے والے لوگوں کو کنٹرول کرنے کے لیے ان کے مد مقابل اسی طرح کے لوگوں کو لگایا جائے تاکہ وہ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی دوڑ میں بادشاہ وقت کے لیے خطرے کا باعث نہ بن سکیں اور اسی طرح ان دونوں مخالف طبقوں کے درمیان چند ایسے لوگ بھی ہونے چاہئیں جو ضرورت پڑنے پر مصالحت کرا سکیں اور معاملات بگڑنے نہ دیں۔

بیکن نو آبادیاتی دور کا ایسا ادیب تھا جب برطانیہ اپنے مقبوضات کے سبب مسلسل روبہ ترقی تھا۔ ان ممالک کو اپنے دائرہ اثر میں رکھنے کے لیے دولت مشترکہ کی ایک تنظیم بنائی گئی تھی جن میں جنوبی ایشیا کے کئی ممالک سمیت آسٹریلیا اور کینیڈا کے وسیع خطوں پر مشتمل ممالک بھی شامل ہیں۔ Of Custom and Education بیکن کا وہ مضمون ہے جس میں بیکن نے انسان کے قدرتی رجحان اور نظریات پر بات کی ہے۔ اس کے مطابق انسان کا علم بے شک کتنا ہی گہرا اور وسیع کیوں نہ ہو وہ معاشرے مروجہ اصولوں کے تابع ہوتا ہے۔ ان رسوم کو بیکن توہمات کا نام دیتا ہے۔ اس کے مطابق اس طرح کی توہمات اور رسوم کو تبدیل کر کے بہتر معاشرے کے قیام کی جانب پیش رفت کی جاسکتی ہے۔ بیکن کا اشارہ غالباً برصغیر کی ان قبیح رسوم کی جانب ہے جو انسانی جانوں کے ضیاع کے ساتھ ساتھ معاشرے کی بدنمائی کا باعث ہے۔ کہتا ہے کہ انسانوں کو مل کر ایسی رسوم ترتیب دینی چاہئیے یا ان رسوم میں تبدیلی کرنی چاہیے جو انسانوں کو اکٹھا کرنے اور یکساں سوچ کا حامل بنادے۔ نہ کہ معاشرے کے چہرے پر بدنما داغ کی مانند نمایاں ہو کر اقوام عالم میں رسوائی باعث ہے۔ ایسی صورت حال میں بہتری کے لیے اوائل عمری میں ہی بچوں کو تربیت دے کر بہتری کی امید رکھی جاسکتی ہے۔ دولت مشترکہ میں شامل ممالک ان کی توجہ کا خاص مرکز ہیں۔

> For common-wealths and good governments do nourish virtue grown, but do not much mend the seeds. But the misery is that the most effectual means are now applied to the ends least to be desired.[1]

ترجمہ:

> (دولت مشترکہ اور دیگر فلاحی حکومتوں کو چاہیے کہ وہ نیک اور اچھی رسوم کو پروان چڑھائیں مگر ان رسوم کی بہتری کے لیے بہت زیادہ ترمیم اور تبدیلی کی قطعاً ضرورت نہیں لیکن تکلیف دہ امر یہ ہے کہ زیادہ مئوثر ذرائع کو (ان قبیح رسوم) کے خاتمے کے لیے استعمال میں لایا جانا ضروری ہے۔)

دولت مشترکہ کے ممالک کے حوالے سے اس کی بحث اس بات کی غماز ہے کہ وہ اپنے فائدے کے ساتھ ساتھ عوامی فائدے کے لیے نہایت غلط رسوم میں قابل لحاظ تبدیلی کا بہت بڑا داعی تھا کیونکہ یہی ایک راستہ ہے جس سے مستقل تبدیلی ممکن ہے۔ رویوں کو تعلیم کے تابع کر کے اس طرح کے غلط رسوم میں تبدیلیاں، زود اثر اور کافی ثابت ہو سکتی ہیں۔ فکری لحاظ سے بیکن کا یہ مضمون بے شک مختصر ہے مگر اس کا پیغام نہایت واضح ہے۔ جس کو بہت ساری تشریحات کے بعد ہی بیان کیا جا سکتا ہے۔

Of Superstition گزشتہ مضمون Of custom and education کی مانند مشترک نفس مضمون لیے ہوئے ہے۔ Superstition کا عمومی مطلب توہم پرستی ہے جس پر of custom and education کی بنیاد ہے مگر یہ مضمون مافوق الفطرت اشیا اعتقاد کے حوالے سے ہے۔ بیکن کے مطابق خدائے بزرگ وبرتر کے بارے میں غلط عقیدہ رکھنے سے اس پر ایمان نہ رکھنے والے زیادہ بہتر ہیں۔ Of superstition میں بیکن اپنے مشاہدے کی بنیاد پر کہتا ہے کہ لادین افراد چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان نہیں رکھتے لہٰذا اس ذات بابرکت کے بارے میں غلط عقیدہ رکھنے سے بھی باز رہتے ہیں۔ وہ عقل پر مبنی بات کرتے ہیں اور دنیاوی فکر و تدبر سے بھرپور ہوتے ہیں اور معاشرے کے لیے کسی بھی قسم کے خوف و خطر کا باعث نہیں بنتے۔ بیکن کا یہ مضمون درحقیقت اہل پسند اور عیسائیوں میں رومن کیتھولک عقیدے کے حامل افراد کے بارے میں جو بیکن کے عقیدے کے مطابق معاشرے کے لیے سخت مضر ہے، کیونکہ ان کی توہمات انسانی فکر کی وسعت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں:

> The causes of superisitions are: pleasing and sensual rites and ceremonies; excess of out wards and pharisaical holiness; overgreat's reverence of traditions, which can not but load the church; the strategems of prelates for their own ambition and lucre.[۲]

تعصب اور توہم کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں:

(خوش کر دینے والی اور بغیر کسی مذہنی اور معاشرتی گہرائی اور روحانی پس منظر رکھنے والی رسومات اور معاشرتی اقدار اچھی نہیں بلکہ چرچ کی گراں باری میں اضافے کا سبب بن رہی ہیں۔)

اس مضمون میں گزشتہ مضمون کی مانند رسوم کی مانند توہمات کے بے حد طاقت ور ہونے کے جانب اشارہ ملتا ہے۔ بیکن نے اگرچہ اس مضمون میں توہمات کی بیخ کنی کی جانب کوئی اشارہ نہیں کیا مگر ان کا مطمع نظر یہ ہے کہ اس طرح کی رسومات و تہمات کو معاشروں سے اکھاڑ پھینکا جائے تاکہ مذہبی رواداری انسانی ترقی اور پر سکون معاشرے کے قیام میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے پیش رفت کو ممکن بنایا جاسکے کیونکہ توہم پرستی پر مبنی رسومات چونکہ مذہب کے پردے میں ہوتی ہیں اس لیے یہ انسانوں کے جذباتی ومادی نقصان کے ساتھ ساتھ معاشرے کو خراب کرتی ہیں۔ اس سے معاشے میں عدم برداشت اور تندخوئی پروان چڑھتی ہے۔ بدعقیدہ شخص بندر کی طرح بدنما ہوتا ہے۔ اس وجہ سے انسانوں کو مل کر ایسی رسومات کے خاتمے پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے جو ان کے فلاح کا راستہ ہموار کر سکے۔

Of Nobility بیکن کا وہ مضمون ہے جس میں بیکن نے Good Will یعنی اچھی شہرت کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ No bility بمعنی شرافت کے استعمال ہوئی ہے۔ بیکن کے مطابق اچھی شہرت کو دو سطحوں میں موثر طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اول یہ کہ یہ ذاتی معاملات میں توازن پیدا کرتی ہے تو دوسری جانب خیر سگالی اور کسی کے لیے قبول عام ہونا اس کو اچھے عہدے تک پہنچانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ بیکن کے مطابق جمہوری طرز حکومت میں اچھی شہرت عوامی مقبولیت میں اضافہ کرتی ہے۔ Of Superstition کی مانند اس مضمون میں بھی عوامی مقبولیت کو مادی فوائد کے حصول میں ایک معاون پہلو کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ بیکن کہتا ہے کہ اچھے اور ثروت مند طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں سے لوگ حسد نہیں کرتے۔ اس لیے انہیں اعلیٰ عہدوں پر فائز کرنے اور ملکی امن عامہ کے قیام میں مدد ملتی ہے۔ بیکن کے بیشتر مضامین کی طرح یہ مضمون گہرے نفسیاتی مطالعے کا غماز ہے۔ اس مضمون میں بیکن روحانی تبلیغ کی

بجائے دنیاوی فوائد کے حصول پر زور دیتا ہے۔ بیکن کے خیالات اس مضمون میں نہایت واضح ہیں۔ کوئی بھی جملہ مبہم ابلاغ کا حامی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیکن کا مطمع نظر سمجھنے کے لیے زیادہ دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ بیکن کے اس مضمون سے کہ بیکن اگرچہ گہری فلسفیانہ گفتگو کرتا ہے چونکہ اس کا انداز عام انسانوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ادبی ذوق رکھنے والے لوگوں کو بیک وقت متاثر کرتا ہے۔ اس مضمون کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بیکن نے اپنے مضامین میں ہمیشہ کائناتی حقائق کے بیان سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ اس لیے ہر شخص اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اس مضمون سے استفادہ کر سکتا ہے۔ بیکن بادشاہت کے فروغ اور جمہوریت کی ناکامی کے لیے کوشاں تھا۔ اس لیے بادشاہ کو مشورہ دیتے وقت اس کا ذہن انسانی نفسیات کے عین مطابق کام کرتا ہے۔

Of Innovation بیکن کا وہ مضمون ہے جس میں بیکن نے جدت پسندی اور ایجادات کے مضمرات سے آگاہ کیا۔ اس کے مطابق ایجادات خواہ کتنی ہی فائدہ مند کیوں نہ ہوں لوگوں کے لیے آسانی سے قابل قبول نہیں ہوتی۔ انسان فطرتاً قدامت پرست واقع ہوا ہے۔ وہ اپنے ماضی، پرانی رسوم اور عادات کو بآسانی چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا اور حتی الامکان چمٹے رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ قدیم اساطیر اور آباؤ اجداد کی کہانیوں کی پسندیدگی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کو اس کا ماضی زیادہ پسند ہوتا ہے۔ وہ مستقبل بینی کی بجائے ماضی پرستی کی جانب فطری طور پر زیادہ مائل ہوتا ہے۔ یہ مضمون سولہویں اور سترھویں صدی کی یورپی صنعتی ترقی کی یاد دلاتا ہے۔ جب یورپ میں تیزی سے ہونے والی صنعتی ترقی نے وہاں کے انسانوں کی زندگی میں سکون بھرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ماضی کے بارے میں خلش میں مبتلا کر دیا۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان قدیم رسوم اور روایات کے ساتھ ساتھ چیزوں سے بھی لگاؤ رکھتا ہے۔ یہ جب سائنسی ترقی کے نتیجے میں ہونے والی ایجادات اس کے راستے میں آتی ہیں۔ تو وہ انہیں بلا جھجک قبول نہیں کرتا بلکہ پہلے پہل اپنے ذہن و دل کو ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بیکن انسانی ایجادات کو قبول کرتے ہوئے انسان کی جھجک اور تذبذب سے بخوبی آگاہ ہے۔ اس لیے وہ تبدیلیوں کی رفتار کو سست کرنے پر زیادہ زور دیتا ہے۔ اس کے مطابق دھیرے دھیرے اور خاموشی سے ہونے والی تبدیلیاں معاملات کے سدھار اور انسان کو الجھن سے بچاتی ہیں۔ بیکن کے

مطابق نئ ایجادات کو معاشروں میں متعارف کراتے وقت ریاست کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے۔ اس طرح کی قانونی اور سیاسی اصلاحات کرنی چاہیے جن کی مدد سے سائنسی ایجادات کو انسانوں کے لیے قابل قبول بنا کر پیش کیا جاسکے۔ بعض ایجادات پر حکومت کو روک بھی لگانی چاہیے۔ کیونکہ اس طرح ایجادات معاشرے کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیتی ہیں۔ وہ مشورہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ میں کسی ایجاد کے بارے میں تذبذب کی بجائے تحقیق اور تجربے کا رویہ اپنانا چاہیے۔ اگر وہ ہماری طبیعت سے مناسبت نہ رکھتی ہو تو فوری طور پر رد کرنے کی بجائے افادیت کی نظر سے دیکھا جانا چاہیے۔ بیکن اس مضمون میں سائنسی ایجادات کو نہایت سرعت سے اپنانے سے تباہ کن قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

> Bacon says that time brings great changes, but it works quality and slowly; so, the changes brought by time does not look upsetting. It were good if men followed the example of time and did not invent things speedily and abruptly. It is nature of men that whatever he sees new, gets disturbed because a new invention is beneficial for some people and damaging to others.[۳]

(بیکن کہتا ہے کہ وقت بڑی اور مئوثر تبدیلیوں کا باعث ہوتا ہے لیکن یہ آہستگی اور معیار کو مدِ نظر رکھتا ہے۔ اس لیے وقت کی لائی ہوئی تبدیلیاں اضطراب کا موجب نہیں بنتی۔ یہ اچھا ہوتا کہ اگر انسان وقت کی مثال کے مطابق تبدیلیاں لانے کی کوشش کرتے اور چیزوں میں سرعت اور بے ضابطگی کے ساتھ ایجادات کو متعارف کروانے سے گریز کرتے۔ یہ انسانوں کی فطرت ہے کہ وہ جب کسی بھی نئ چیز کو دیکھتے ہیں تو اضطراب ہو جاتے ہیں کیونکہ ایک نئ اختراع چند لوگوں کو فائدہ پہنچاتی ہے مگر زیادہ لوگوں کی زندگی میں تباہی اور بے چینی کا باعث بنتی ہیں۔)

یہ مضمون انسانی نفسیات کے تجزیے کے بعد لکھا گیا ہے۔ لہٰذا اس میں ہر وہ پہلو شامل ہے جو ایجادات سے متعلق انسانی ذہن کو درپیش ہو سکتے ہیں۔

مضمون Of envy میں بیکن نے رشک اور حسد کے طاقتور ترین جذبوں سے متعلق بات کی ہے۔ بیکن نے اس مضمون میں انسانی فطرت کے عین مطابق ان گروہوں یا افراد کی نشاندہی کی ہے جو رشک اور حسد کے جذبے سے دوسروں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ بیکن کے مطابق معذور اور بدشکل، بڑھاپے پر مائل اور خواجہ سرا یا ناجائز اولادیں اکثر و بیشتر دوسرے لوگوں سے حسد کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ لوگ اپنی بنیادی خامی کو ختم کرنے میں ناکام ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب مقابلے میں شریک نہیں ہوتے تو ایک دوسرے سے حسد کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ بیکن بتاتا ہے کہ حسد کرنے والے لوگوں کا دوسرا گروہ ہم پیشہ لوگوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ جب کسی ادارے میں ملازمت کرتے ہیں تو شاندار کردار ادا کرنے والے لوگوں سے رقابت اور حسد کرنا شروع کر دیتے ہیں کیونکہ ایسے لوگ احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ان کا جب کوئی ساتھی کسی واقعے کی وجہ سے شہرت پا جائے تو ایسی صورت میں حاسد پن کا کینہ دگنا ہو جاتا ہے۔ لوگوں کے بارے میں بتاتے ہوئے بیکن کہتا ہے کہ لوگ سب سے زیادہ ان سے حسد کرتے ہیں جو اپنی دولت اور خوشحالی کی نمائش کرتے ہیں جب کہ سادہ مزاج اور عاجز فطرت لوگوں سے سب سے کم حسد کیا جاتا ہے، اشرافیہ کے لوگوں اور وہ افراد جو بہت تکالیف اٹھا کر اپنی منزل پر پہنچتے ہیں لوگ ان سے کم ہی حسد کرتے ہیں۔ بیکن کے مطابق جب کسی وزیر سے کوئی حسد کرتا ہے تو یہ بات جلد ہی بادشاہ تک پہنچ جاتی ہے، بیکن حسد کو ایک غیر اخلاقی جذبہ قرار دیتا ہے۔ جس کی وجہ وہ یہ بیان کرتا ہے کہ یہ جذبہ کسی طور سرد ہونے میں نہیں آتا اور تمام احساسات و جذبات سے زیادہ غیر اخلاقی ہوتا ہے، بیکن اسے ایک شیطان صفت قرار دیتا ہے۔ مذکورہ مضمون میں بیکن نے حسد کے جذبے کی پیمائش دو پیمانوں سے کی ہے، پہلا پیمانہ وہ افراد یا گروہ ہیں جو کسی شخص سے حسد کرتے ہیں، جبکہ دوسرا پیمانہ حسد کے جذبے کے تعین اور حدود کے بیان کے حوالے سے ہے۔ بیکن نے اگرچہ یہ نہیں بتایا کہ کس شخص کا حسد کس انسان کو کتنا متاثر کر سکتا ہے۔ اس لیے ہم مضمون کے مطالعے سے صرف اشارات کی

مدد سے جذبہ حسد کی پیمائش کا کامیاب اور حقیقی پیمائش کے ساتھ ساتھ ان کی شدت میں کمی کے حوالے سے اقدامات اٹھاسکتے ہیں۔

مضمونOf Unity in Religion میں مضمون نگار فرانسز بیکن کہتا ہے کہ مذہب انسانی معاشرے کو جوڑنے کا سب سے طاقت ور عنصر ہے۔ یہ اتحاد باہمی کو قائم رکھنے میں سب سے اہم کردار ادا کر سکتا ہے اور اس کی مدد سے غیر ضروری بندشوں اور روایات کے عنصر کو توڑنے میں بہت مدد ملتی ہے۔ مگر دوسری جانب مذہب میں غلط عقائد انسانوں کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں کیونکہ جب کوئی غلط عقیدہ مذہب کی تشریح میں شامل ہو جاتا ہے تو یہ انسانوں کی بنیادیں اکھاڑ کر انہیں اور اس معاشرے کو ختم کر کے رکھ دیتا ہے۔ بیکن کہتا ہے کیاڈاکٹر ہوں یا انجینئر یا کسی اور پیشے سے متعلق ہوں، جب آپ چرچ جاتے ہیں تو آپ کا یہ اتحاد آپ سے پیشے، زبان، گھر اور دولت کا پتا نہیں دریافت کرتا بلکہ مذہب صرف اور صرف آپ کو روحانی طور پر پاکیزہ کر دیتا ہے۔ دوسری جانب جب ہجر ایک غلط عقیدے کی پیروی کرتے ہوئے اسے مذہب میں داخل کرتے ہیں تو یہ انسانوں کے مابین ٹکراؤ کی کیفیت پیدا کر کے انہیں اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔

یورپی نشاط ثانیہ کے دور میں دو بڑی تبدیلیاں مذہبی لحاظ سے رونما ہوئیں۔ یہ عیسائیت کا دو فرقوں یعنی کیتھولک اور پروٹسٹنٹ میں تبدیل ہونا تھا۔ پروٹسٹنٹ بعد ازاں مزید کئی گروہوں میں بٹ گئے۔ بیکن قرار دیتا ہے کہ مذہبی وحدت جو کہ ملی وحدت کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔ جب ثمر آور ثابت ہوتا ہے اس کے دو قسم کے ثمرات فوری طور پر معاشرے میں نظر آنے لگتے ہیں۔ پہلا یہ کہ دیہات اور دوسرا اتحاد کے لیے مضبوط بنیادوں اور سہاروں کی فراہمی جو کہ مذہبی وحدت کے فوری ثمرات میں سے ہیں۔ اتحاد کے ثمرات کی وضاحت کرتے ہوئے بیکن کہتا ہے کہ یہ دو قسم کے معمولات میں یکسانیت پیدا کرتا ہے۔ پہلا یہ کہ یہ چرچ کے اندر یکساں قسم کی عبادت کا موقع فراہم کرتا ہے جن سے عقائد اور روایات کی تطہیر میں مدد ملتی ہے۔ تو دوسری جانب یہ مذہب کے دائرے سے باہر بھی انسانوں کو ہر لمحے رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ بیکن نے اپنے اس مضمون میں رومن کیتھولک فرقے کو شدید طنز و تشنیع کا نشانہ بنایا کیونکہ یہ عقیدہ مضبوط

بنیادوں کی بجائے روایات اور توہمات کا منبع ہے۔ بیکن کے مطابق مذہب کی حقیقی تعلیمات یہ نہیں کہ آپ کسی بھی مذہب کے نام پر قتل کر دیں اور قتل میں مذہب آپ کا کشتی بان بن جائے بلکہ مذہب انسانیت کی اعلیٰ قدروں کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ بے گناہ کا قتل اور اسے خدا تعالیٰ سے منسوب کرنا بذات خود ایک نہایت غلط فعل ہے۔

بیکن اس گفتگو کی مدد سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ کس طرح مذہب انسان کے لیے فائدے مند ثابت ہو سکتا ہے جب اعلیٰ انسانی اقدار کو فروغ دے کر عقائد میں موجود برائیوں کو ختم کر دیا جائے اور مذہب کے نام پر قتل وغارت گری اور مناظرت کی بنیاد پر تقسیم پر روک لگائی جائے۔

مضمون Of Wisdom for Man's Self میں بیکن نے دانائی کے بہتر استعمال کی جانب اشارہ کیا ہے۔ بیکن کے مطابق خود غرضی پر مبنی دانائی یا ہوشیاری معاشرے کے لیے کسی قسم کا فائدہ نہیں دیکھتی۔ اس قسم کی چالاکی یا خود غرضی دوسروں کے حقوق کو غصب کر کے اپنا فائدہ تلاش کرتی ہے۔ بیکن کے مطابق صحیح طریقہ یہ ہے کہ اپنے مفادات کو معاشرے کے مجموعی مفادات سے ہم آہنگ کر دیا جائے تاکہ سب کا فائدہ ہو۔ اس طرح انسانی معاشرے کو نقصان بھی نہیں ہو گا اور انسان کو فرد واحد کی حیثیت سے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خود غرضی ہو سکتا ہے کہ انسان کو وقتی فائدہ پہنچائے مگر بالآخر ایسا شخص اپنے لیے نقصان کا باعث ہوتا ہے۔ ایسے شخص کی مثال اس چوہے کی سی ہوتی ہے جو پوری دعوت کو تلپٹ کر دے مگر بالآخر اسے دعوت سے نکال دیا جاتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے بیکن نے سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے اسے ایک مگر مچھ سے تشبیہ دی ہے۔ جو دوسروں کو دھوکے میں رکھ کر شکار کرتا ہے۔ بیکن کہتا ہے اس قسم کی خود غرضی میں آپ اکیلے رہ جاتے ہیں اور زیادہ تر لوگوں کی نظریں آپ کے کام پر جم جاتی ہیں۔ اس لیے دل جمعی اور یک سوئی سے مقصد کا حصول ممکن نہیں رہتا۔ بیکن نے یہ مضمون انسانی معاشرے کے گہرے مشاہدے کے بعد تحریر کیا۔ ہر معاشرے میں ایسے افراد کی کمی نہیں جو خود غرضی کے جذبے کے تحت وقت سے پہلے اور حصے سے زائد لینے کی تگ ودو میں نہ ہو مگر چند ایک کو چھوڑ کر اکثر وبیشتر افراد کا رویہ بالآخر ان کے حق میں نقصان دہ ثابت ہوتا ہے اور لوگ انہیں برا خیال کرتے ہوئے ان کے حق میں دلیل دینے سے باز رہتے ہیں۔ مزید

بر آں زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں جب انہیں مدد کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ اپنے سامنے موجود تمام راہوں کو بند پاتے ہیں۔ کیونکہ دوسروں کی راہ کی رکاوٹ بننے والا شخص کس طرح دوسرے لوگوں سے راستہ مانگنے کی جرات کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں اکثر لوگ مروت اور رحم دلی کو بالائے طاق رکھ کر ان کی مدد سے انکاری ہو جاتے ہیں۔ بیکن نے ایسے لوگوں کے لیے چوہے یا مگر کچھ کی مثال پیش کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

> It is the wisdom of crocodiles that shed thears when they would deveour. But that which is specially to be noted as, that those which, are many times unfortunate.[۴]
>
> (یہ وطیرہ مگر مچھ کا ہے کہ (دکھ اور افسوس کا اظہار) اور آنسو اس وقت بہائے جائیں جب ان کی ضرورت نہ ہو۔ مگر انہیں خاص طور پر محسوس کیا جائے تا کہ لوگوں کے دلوں میں ہمدردی کا احساس پیدا ہو۔ یہ بد قسمتی کی بات ہے۔)

یہ مضمون بیکن کے گہرے اور عمیق معاشرتی نفسیاتی مطالعے پر مبنی ہے جو اس قسم کے رویوں کے حامل افراد کے لیے ایک نشان راہ نمائی ہے۔ مضمون Of Negotiating میں فرانسز بیکن نے معاہدوں کی تحریری صورت ہونے پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔ اس کے مطابق یہ بات ہمیشہ کہی جاتی ہے کہ مخالف گروہ سے بات کرتے ہوئے قانونی طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے۔ بیکن نے اپنی زندگی کا ایک طویل عرصہ ایک وکیل اور قانون دان کی حیثیت سے بسر کیا۔ اس لیے وہ لین دین اور بات چیت کرتے وقت خطوط کی اہمیت سے بخوبی آگاہ ہیں۔ بیکن کے مطابق زبانی کلامی بات کرنے کا چونکہ کوئی تحریری وجود نہیں ہوتا اس لیے دوسرا فرق بآسانی معاہدے سے دست بردار ہو سکتا ہے۔ عدالت دو فریقوں کے مابین چونکہ ایک ثالث کا کردار ادا کرتی ہے اس لیے اس میں آپ کے لیے حوالے کے ساتھ بات کرنے میں آسانی رہتی ہے۔ اس مضمون میں مذکورہ طریق کے مطابق بات کرنے کے فوائد بیان کیے گئے ہیں۔ اس کے مطابق اس میں ایک شخص پوری طرح اپنے آپ کو کھول دیتا ہے اور کسی دقت سے بچنے کے لیے قانونی نکات کی کمی کو اپنی پوری ذہنی استعداد سے ختم کرنے میں کوشاں رہتا ہے۔

دوم یہ کہ اس کی وجہ سے ایک شخص کے اعتماد میں اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ کہ وہ معاملہ کرتے وقت پر جوش محسوس کرتا ہے۔ سوم یہ کہ یہ آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ کسی معاملے کو پوری گہرائی کے ساتھ جان سکے۔ اس کے فریق مخالف کے اطوار اور انداز اس پر پوری طرح عیاں ہو جاتے ہیں۔ اس کی کمزوری اور اس کا خوف بھی قانونی معاملے کرنے والے پر یکساں طور پر عیاں ہو جاتا ہے۔ چہارم یہ کہ اس کی مدد سے انتہائی چالاک اور دوستی کے پردے میں موجود دشمن اپنا وار کرنے میں ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ ایک ایسا قانونی معاملہ جس میں خط وکتابت کی تمام تفصیل موجود ہو کسی شخص کے غلط ارادوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتی ہے۔ اس طرح کے لین دین میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ کم بولو اور زیادہ سے زیادہ کی توقع رکھو۔ یہ مضمون بیکن کے قانونی معاملات پر گہری دستگاہ کا مظہر ہے جو انسان کو معاملات زندگی میں قانونی طریقہ اختیار کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔ قانون کے معاملات کو زبانی طے کرنے سے جن سنگین مشکلات کا سامنا ہو سکتا ہے اس حوالے سے بیکن کا یہ مضمون تمام اہم معاملات کے سدھار میں کامیابی کی ضمانت بن سکتا ہے۔ بشرطیکہ معاملات طے کرتے ہوئے بیکن کے نکات کو پیش نظر رکھا جائے۔

مضمون Of honour and Reputation میں فرانسز بیکن نے شہرت اور عزت کے کاروباری یا تجارتی پہلو پر بحث کی ہے۔ بیکن کے مطابق کسی انسان کی اچھی شہرت اس کی قابلیت اور نیک خوئی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ کیونکہ عوامی رائے کسی شخص کے بارے میں اتنی جلدی اور تیزی سے تبدیل نہیں ہوتی۔ بیکن کے مطابق عزت کا حصول کسی انسان کی نیک خوئی کا ایک بہتر صلہ ہے جو اس کو موقع عطا کرتا ہے کہ وہ کس طرح اپنی شہرت کو اپنی بہتری اور ذاتی زندگی کی آسائش اور آسانی کے لیے استعمال کر سکتا ہے۔ اس مضمون میں بیکن نے عزت واحترام کی مختلف درجوں کے بارے میں وضاحت سے بات کی ہے۔ بیکن کہتا ہے کہ اچھی شہرت جب بادشاہوں تک پہنچ جائے تو وہ کسی شخص کو بہتری اور کلیدی عہدے پر فائز کر سکتا ہے۔ جو امن عامہ بہتر قوانین کی تیاری اور نفوز میں ریاست کی مدد کر سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں جب شہرت عام کا معاملہ مقاصد کی تکمیل کے لیے ضروری ہو تو ایسا شخص کمانڈر یا جنرل کے عہدے پر بھی فائز ہو سکتا ہے جو بادشاہوں کے سب سے زیادہ نزدیک ہوتے ہیں۔ اس مضمون میں شہرت کے نقصانات کی بھی بات کی گئی ہے۔ شہرت کسی انسان کی

تمام صلاحیتوں کو ظاہر نہیں کرتی جب کسی شخص کو محض شہرت کی بنا پر کسی بڑے عہدے پر فائز کر دیا جاتا ہے تو ایسی صورت میں جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ٹھہرتا تو شاہی طبقے میں عوام کی مانند مایوسی میں اضافہ ہوتا ہے۔ دوم یہ کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جب کسی شخص کو مسائل اور مشکلات کو ختم کرنے کے لیے کسی قسم کا عہدہ پیش کیا جائے تو ناتجربہ کاری کے باعث وہ اسے پورا کرنے سے قاصر ہو۔ یا وہ مقاصد جو اس کی نظر میں زیادہ اہمیت نہ رکھتے ہوں ان کا حصول ضروری ٹھہرے اور وہ انہیں حاصل نہ کر سکے۔ بعض اوقات کوئی عہدہ کسی شخص کے اعصاب کی سختی کو آزماتا ہے۔ شہرت کے حامل اشخاص بعض اوقات اس قسم کے رویوں کو برداشت کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ نتیجتاً ناکامی ان کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ اس مضمون میں فرانسز بیکن مختلف تاریخی واقعات کا سہارا لیتے ہوئے اپنے مطمع نظر کو بیان کرتے ہیں کہ کس طرح اس قسم کے لوگوں کو عوامی بھلائی کے کاموں کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے اور انہیں ایسے آسان مگر ضروری احداف کا حصول ممکن بنانے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے جو بظاہر عوامی مدد کے بغیر انجام دینا ممکن نہ ہو۔

فرانسز بیکن کے مضامین کا فنی جائزہ:

فرانسز بیکن کے مضامین کا جائزہ لیتے ہوئے چند نمایاں خصوصیات ہمارے سامنے آتی ہیں۔ اول الذکر یہ کہ بیکن کا اسلوب براہ راست اور مطلب کی باتوں پر قائم ہے۔ ان کا بحث و مباحثے کا طریقہ عالمانہ ہے لیکن وہ علوم کی ترویج کرتے ہوئے اپنے موضوع سے ہٹ نہیں پاتے۔ لیکن یہ طریقہ کار خوشیاں پیدا کرنے والے اور امید افزا ہے۔ اس کے باوجود کہ فرانسز بیکن سچی بات کہتے ہیں۔ ان کا سچ کہنا کسی انسان کو برا محسوس نہیں ہوتا کیونکہ وہ حیات انسانی کی سچائیاں اپنے مخصوص انداز سے ترتیب وار اور دلیل کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ بیکن کا طریقہ ایک حیرت انگیز طریقہ کار ہے کیونکہ جب انسان اپنے ذہنی پس منظر اور تعلیم کے مطابق اپنا کوئی اسلوب اختیار کرتا ہے تو اس میں دو چیزیں ہمیشہ واضح ہوتی ہیں۔ اول یہ کہ اس کا اسلوب خوشی بھرا اور امید افزا ہے یا اس کے برعکس یاسیت، غمی اور نامیدی پر مائل ہے۔ جب کوئی ادیب ان دونوں میں سے ایک طریقہ اختیار کرتا ہے تو عمومی تجزیہ یہ ہے کہ مزاح پیدا کرنے والے ادیب زندگی کے غیر سنجیدہ پہلوؤں کو اپنے مخصوص انداز سے مزاحیہ بنانے کے لیے چند عوامل پیدا کرتا ہے یا تو وہ مبالغہ آرائی سے کام لے کر مزاح پیدا

کرتا ہے یا انتہائی سادگی سے کسی مزاحیہ پہلو کو بیان کر کے مزاح پیدا کرتا ہے۔ بیکن اس حوالے سے ان لکھاریوں میں شامل ہے جو زندگی کے مختلف امور انتہائی سنجیدگی اور متانت سے بیان کرتے ہیں لیکن ان کے بیان عالمانہ انداز اور آفاقی سچائیوں کا ذکر کثرت سے نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود مزاحیہ انداز کے حامل ان کا اسلوب نگارش طبیعت میں گرانی پیدا نہیں کرتا بلکہ ادب سے گہری وابستگی رکھنے والے لوگ ان کے اس پہلو سے حظ اٹھاتے ہیں۔

انتہائی سنجیدگی کے باوجود ان کا انداز فکر بشاشت در لاتا ہے۔ علمیت اور برتری کے اظہار کے لیے بیکن نے بہت زیادہ مرصع زبان استعمال کی ہے۔ جس میں محاورات اور ضرب الامثال کی کثرت نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود بیکن کا اسلوب ابلاغ سب کمی کا شکار نہیں۔ عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ مرصع اور مختلف زبانوں کا استعمال کرنے والے ادیب معنوی گہرائی پیدا کرنے میں ناکام رہتے ہیں لیکن کمال کی بات یہ ہے کہ بیکن نے جس قسم کی زبان استعمال کی ہے اس میں محاورات کی کثرت ہے لیکن حیرت انگیز طور پر زبان ابلاغ کی کمی کا قطعاً شکار نہیں۔ بیکن اپنے مضامین میں زندگی آفاقی سچائیاں پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔

بیکن کا انداز جامعیت لیے ہوئے ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ بات کو انتہائی مختصر اور جامع انداز میں بیان کیا جائے۔ وہ کسی موضوع کا تجزیہ مختصر، جامع، دلیل پر مبنی اور تہہ در تہہ نکات بیان کرتے ہوئے کرتے ہیں۔ مذہبی روایتی غیر مہذبانہ زبان سے گریز روانی اور ایسی باتوں کا ذکر جو سب کے لیے قابل قبول ہے یہی بیکن کا مطمع نظر تھا۔ وہ برداشت، چلم، رواداری اور مذہبی و نسلی منافرت سے گریز کرتے ہیں۔ بیکن کے مضامین میں لاطینی اور یونانی زبانوں کے کلمات بکثرت نظر آتے ہیں جو اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ بیکن ایک وسیع المطالعہ شخص ہے۔ قانون، مذہب، لسانیات اور معاشرت بے پناہ علم رکھنے کے باوجود بیکن کا ذہن الجھن کا شکار نہیں اور کسی دستکار کی مانند اپنے خیالات کو ترتیب وار بیان کرتا ہے۔

ہر چند بیکن نے اپنے مضامین عوام کے لیے تحریر نہیں کیے۔ لیکن بیکن کا پیغام اس کی بیان کی گئی سچائیاں اتنی آفاقی اور خوبصورت ہیں کہ ایک اچھے ادب کی طرح اس کی ہر بات ہر ایک کو اپنے دل کی آواز محسوس ہوتی ہے۔

بیکن لاطینی، انگریزی اور یونانی زبانوں سمیت یورپ کی بہت ساری زبانوں کو اچھی طرح جانتا تھا اور اس کے علاوہ ان کے ادب سے بھی بخوبی واقف تھا۔ اس کے باوجود بیکن نے شعوری کوشش کی کہ اس کی تحریر میں تخیلاتی اور حقیقت سے دور جذبات کا عمل دخل نہ ہو۔ اسی وجہ سے انجیل اور ادبی داستانوں کے حوالے دیتے وقت بیکن نے ان واقعات اور باتوں کو پیش نظر رکھا جو دانش وری حقیقی ہیں۔ بیکن جذبات اور عقل کو ترجیح دینے والا مضمون نگار ہے۔ اس لیے اس کے مضامین میں جذباتی عمل دخل سے زیادہ حقیقی خوبصورتی نظر آتی ہے۔ بیکن نے کوشش کی ہے کہ اس کے مضامین موضوع سے متعلق ہر بات کو جامع اور مکمل صورت میں بیان کیا جاسکے۔ جامعیت اور اختصار کے ہمراہ بیکن کا منطق پر مبنی رویہ اس کی مضمون نگاری کی خوبصورتی کو دوبالا کر دیتا ہے۔ بیکن نے مرصع زبان استعمال کرنے کے باوجود ابلاغ کے پہلو کو نظر انداز نہیں کیا اور یہ کوشش جاری رکھی کہ ایسی تحریر کو ترقی دی جائے جس میں لفظی خوبصورتی کے ساتھ معنوی گہرائی باہم ملی جلی نظر آتی ہیں۔ مسلسل کوشش، مطالعے، گہری سوچ اور معاشرتی رویوں کی بہتر سمجھ نے بیکن کو اس قابل بنا دیا کہ کثیر تعداد میں معاشرے اور اس کے رویوں کا اظہار خیال کرتے ہوئے اس کا قلم علم و فن کے ایسے موتی پروتا رہا جس کی چمک اور تابانی ہنوز ادب کا ذوق رکھنے والوں، قابل رشک اور قابل تقلید ہے۔

بیکن ایک انتہائی پڑھا لکھا شخص تھا۔ لہٰذا الفاظ کی ترتیب اور بندش مجموعی انسانی نفسیات، مذہبی جذبات اور دیگر امور کا بطور خاص خیال رکھا ہے۔ بیکن نے مشکل الفاظ، محاورات اور علامات کا استعمال اپنے علم کے اظہار کے لیے نہیں کیا بلکہ فنی لحاظ سے مفہوم کے مکمل اظہار کے لیے یہ اس کی مجبوری تھی کیونکہ سادہ الفاظ کے استعمال سے اس کا مضمون لکھنے کا مقصد پورا نہیں ہوتا۔ یونانی اور لاطینی ادب سے آگہی رر کھنے کے باوجود بیکن عظیم سکالرز سے قطعاً متاثر نہیں نظر آتا بلکہ اپنے خاص اسلوب اور معاشرے پر گہری نظر اس کے اسلوب میں چاشنی پیدا کر دیتی ہے۔ اس کے مضامین کو سمجھنا عام اذہان کے لیے مشکل ہے۔ مگر ایک دفعہ اس اسلوب سے آگاہی ہو جائے تو باقی تمام نفس مضمون سمجھنا کسی بھی شخص کے لیے مشکل نہیں ہوتا۔ عام واقعات زندگی کے عام فہم جذبے بیکن کے قلم سے خاص بن جاتے ہیں۔ بیکن کے سوچنے کا انداز اتنا اچھوتا اور نیا ہے کہ اس کا تقابل اور اس کے انداز میں لکھنا بڑی حد تک ناممکن ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے بیکن نے پہلے مواد

جمع کیا پھر اس کو درجہ اول اور دوم میں تقسیم کر کے مضمون میں استعمال کیا۔ بیکن کے بعض مضامین اس کی زندگی ہی میں کئی دفعہ دوبارہ شائع ہوئے اور ہر دفعہ بیکن نے اپنے بدلتے نقطہ نظر کے مطابق اس میں تبدیلیاں کیں۔ یہ تبدیلیاں ظاہر کرتی ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ بیکن کی رائے تبدیل ہوتی رہی اور خوب سے خوب تر زندگی کی تلاش میں بیکن نے جملہ بندی اور مضامین کے بنیادی نکات میں تبدیلیاں کیں۔

بیکن کے دور میں مضمون نگاری ایک اچھی صنف اظہار نہیں سمجھی جاتی تھی۔ مضمون نگار عموماً غیر ترتیب اور تیاری کے اپنے خیالات قلمبند کرتے تھے اور اپنا نقطہ نظر واضح کرتے تھے۔ مگر بیکن نے ترتیب اور تیاری کے ساتھ مضمون نگاری کر کے مذکورہ صنف کو ایک گری پڑی صنف سے اوج کمال تک پہنچا دیا۔ مضمون نگاری اس سے قبل بادشاہ کے امور اور اس کی مبالغہ آمیز صلاحیتوں کے بارے میں لکھنے کے لیے استعمال ہوتا رہا تھا مگر بیکن نے پہلی مرتبہ مضمون کو تخیلات اور مبالغہ آمیز خوشامدی باتوں کے علاوہ معاشرے کی صحیح تصویر پیش کرنے میں استعمال کیا۔ اس سے قبل کہ مضمون خوشامد اور تملق کے بیان سے بھرے پڑے ہیں۔ مگر بیکن نے مضمون کے ذریعے عوامی مسائل سوچ اور راہ عمل کی نشاندہی کر کے مضمون کے استعمال اور مقصد کو ہی تبدیل کر دیا۔ بیکن کا یہ انداز اچھوتا ضرور تھا مگر نیا نہیں۔ اس کے باوجود بیکن کے بعد لکھنے والے مضمون نگاروں نے بیکن کی نقل کی ناکام کوشش کی۔

بیکن کا مضمون of Nobility ایک مختصر اور جامع مضمون ہے۔ اس مضمون میں بیکن نے شرافت کے دو پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ شرافت کا ایک پہلو نجی اور دوسرا عارضی ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے الگ شمار ہوتے ہیں۔ مذکورہ مضمون میں بیکن نے طویل جملوں کو رموز اوقاف کی مدد سے مختصر حصوں میں تقسیم کیا ہوا ہے۔ مضمون انتہائی سنجیدہ اور دنیاوی دانش سے بھرپور ہے۔ جملوں کی بندش انتہائی جامع، مشکل اور خوبصورت ہے۔ بیکن نے اپنے مضمون میں انسانی نفسیات کو لگی لپٹی رکھے بغیر انتہائی صاف اور سلیس زبان میں بیان کیا ہے۔ شرافت کے مختلف نظام ہائے حکومت کے لیے ضروری قرار دیا ہے۔ بیکن ہر انسانی خوبی یا خامی کو دنیاوی مفاد کے لیے استعمال کرنے پر زور دیتے ہیں۔ لہٰذا شرافت جیسی اعلیٰ ترین خوبی بھی ان کے نزدیک بادشاہوں یا جمہوری حکومتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بیکن کے دیگر مضامین کی طرح یہ مضمون بھی

فلسفیانہ خیالات کا حامل ہے۔ بیکن لمبے مگر خوبصورت وقفوں کے ساتھ لکھے ہوئے جملوں کی مدد سے قارئین کا دل موہ لینے کا فن جانتا ہے۔ غیر جذباتی انداز ہونے کے باوجود مذکورہ مضمون میں دلچسپی اعلیٰ ترین اقدار کی تقلید پر زور دیتا ہے۔ یہ مضمون بیکن کی سوچ کو اچھی طرح واضح کرنے میں قاری کی مدد کرتا ہے۔ بعض جملوں میں بناوٹ اتنی شاندار اور خوبصورت ہے کہ ان جملوں سے مضمون میں موسیقیت پیدا ہوتی ہے۔ بیکن نے ایک ہی جملے میں مطمع نظر بیان کرنے کے علاوہ اسی جملے میں اس سے متعلق دلیل لے کر آنے کو ترجیح دی ہے بلکہ بعض جگہ ان کے جملوں میں غنائیت اور موسیقیت محسوس ہوتی ہے۔

> A great and potent nobility addeth majesty to a monarch, but diminisheth pouer, and putteth life and spirit into the people, but presseth their fortune.[۵]

بیکن ملک میں قانون کی حکمرانی اور شریف لوگوں کے رویوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ بیکن کی حوصلہ افزائی میں مذہب سے زیادہ دنیاوی دانش زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ مضمون کے آخر میں مختلف امور کو زیر بحث لا کر موازنے کی صورت حال پیدا کرتے ہیں۔ آخر میں کہتے ہیں کہ شریف لوگوں کو بڑے عہدوں پر فائز کرنے سے معاشرے میں نہ صرف شرافت کا بول بالا ہوتا ہے بلکہ غلط لوگوں کے مقابلے میں طاقت کا توازن بھی پیدا ہوتا ہے۔ جو ایک صحت مند معاشرے کی تعمیر کے لیے اساسی اہمیت رکھتا ہے۔

بیکن کا مضمون Of Envy انسانی جذبہ رشک وحسد کے بارے میں بیان کرتا ہے۔ بیکن جذبہ رشک وحسد تحریک اور وجوہات بیان کرتا ہے۔ اس مضمون میں دلیل در دلیل بات کی گئی ہے۔ بیکن پر بیان کے بعد اس کے حق یا مخالفت میں دلیل لے کر آتا ہے چونکہ یہ دلیل مبنی پر حقیقت اور انسانی نفسیات کے گہرے مطالعے سے وجود میں آتی ہے لہٰذا بیکن کا نقطہ نظر نہ صرف مضبوط اور گہرا نظر آتا ہے بلکہ اس میں موجود احساس مزید گہرا اور مکمل ہو جاتا ہے۔ انسان خواب پسند واقع ہوا ہے۔ اور اس خواب کو حقیقت میں بدلنے کی ہمیشہ تگ ودو میں رہتا ہے۔ لہٰذا بیکن کا ہر بات کے لیے دلیل لے کر آنا اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان خواب اور خواہشات رکھتے ہوئے بھی حقیقت کی جستجو میں رہتا ہے۔ بیکن کا نقطہ نظر دلفریب، جملوں کی

بندش خوبصورت اور تاثر بلند پایہ ہے۔ بیکن کے ابتدائی جملے انسانی نفسیات کو مد نظر رکھتے ہوئے لکھے جاتے ہیں۔ ہر جملے کے آخر میں سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

There be more of the affections which have been noted to fascinate ore beuiteh, but have and envy. They both have vehement wishes; they frame themselves readily into imaginations and suggestions and they come easily into the eye, expecially upon the presence of the objects.[۲]

(بہت سے دیگر جذبوں کی مانند حسد اور رشک کے جذبے کو خوبصورت الفاظ اور القابا ت میں ملفوف نہیں کیا جاسکتا۔ حسد اور رشک کے جذبے خواہشات سے نکلتے ہیں۔ یہ تصورات اور ترغیبات کی مدد سے آسانی سے کسی بھی آنکھوں میں بسائے جاسکتے ہیں۔ خاص طور پر مخصوص حالات میں ان کا اطلاق مزید سہل ہو جاتا ہے۔)

بیکن کے خیالات ہی نہیں بلکہ مضمون کی تقسیم میں بھی سائنسی انداز اختیار کیا ہے۔ خالصتاً فلسفیانہ موضوع کو ادبی رنگ دینے میں ان کے سائنسی انداز کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ چونکہ مضمون میں مشکل الفاظ اور غیر ضروری طوالت سے گریز کیا گیا ہے۔ لہٰذا قارئین کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کے لیے ہر نقطہ نظر کے بعد دلیل پیش کرتا ہے۔ اپنے دیگر مضامین کی مانند اس مضمون میں بھی مصنف نے اول اس جذبے کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں کہ جذبہ حسد کس طرح سے انسانوں کے اندر نمودار ہوتا ہے یا الفاظ دیگر کس طرح سے انسانی شخصیت کو مجروح کرتا ہے۔ اس مضمون میں مختصر مگر بامعنی الفاظ میں بیکن نے مفادات کے تذکرے کو اولیت اور اہمیت دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رشتے دار اور احباب یا ہم پیشہ لوگ کس طرح جذبہ حسد کا شکار ہوتے ہیں۔ آخر میں ان تمام معاملات میں جذبہ حسد کی وجوہات بیان کی ہیں اور اس بات کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ یہ جذبہ تمام دیگر جذبات واحساسات کے مقابلے میں زیادہ خراب ہے کیونکہ یہ انسانی اخلاق کو بگاڑ کر اسے اشراف المخلوقات کے درجے سے پیچھے دھکیل دیتا ہے۔ بیکن کے نزدیک یہ ایک شیطانی جذبہ ہے۔

بیکن نے اپنے مضمون Of Supersititions میں مضمون نگاری کا نیا اسلوب متعارف کروایا ہے۔ انہیں اس بات کا پتا ہے کہ حقیقی باتیں کرنے میں اور حقیقت نگاری میں کم لوگ ہی دلچسپی رکھتے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے اپنے مضمون کی ابتدا میں ایک اچھوتے جملے سے کیا:

> It were better of have no opinion of God at all than such an opinion as is unworthy of him.[۷]
>
> یہ بہتر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں برا اعتقاد رکنے کی بجائے یقین اور عقیدہ رکھنے سے گریز کیا جائے۔

بیکن کا یہ جملہ قارئین کے اندر نہ صرف تجسس پیدا کرتا ہے بلکہ انہیں اس بات پر اکساتا ہے کہ وہ بیکن کے پورے مضمون کو پڑھے بغیر نہ چھوڑے۔ یہاں کسی مذہبی فرقے کی دل آزاری نہیں کی گئی بلکہ انتہائی سائنسی انداز میں لگی لپٹی لکھے بغیر اپنے نقطہ نظر کا اظہار کیا کہ خدا تعالیٰ سے متعلق غلط نظریہ یا نقطہ نظر رکھنے سے بہتر ہے کہ اس کے اوپر ایمان نہ رکھا جائے۔ آسان الفاظ میں یہ ان لوگوں پر سخت تنقید کی ہے جو اللہ تعالی پر ایمان تو رکھتے ہیں مگر ان کی ذات پر پر تنقید کیے بغیر نہیں رہ سکتے یا وہ عقائد رکھنے والے وہ لوگ جو انتہائی مایوسی کے عالم میں اپنے حواس میں نہیں رہتے اور ذات باری تعالیٰ کے بارے میں انتہائی نازیبا الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ بیکن نے اس مضمون میں رومن کیتھولک چرچ کے پیروکاروں پر سخت تنقید کی ہے۔ اس مضمون میں بیکن نے اپنے دیگر مضامین کی مانند مرصع اور بامعنی الفاظ استعمال کیے۔ بیکن کی یہ خوبی ہے کہ انتہائی مشکل زبان میں لکھنے کے باوجود ان کے الفاظ میں ابلاغ کا پہلو واقع رہتا ہے۔ بیکن کسی فلسفے کو روبہ کار نہیں لاتا۔ اس کے باوجود ان کے الفاظ میں فلسفیانہ گہرائی موجود رہتی ہے۔ جیسا کہ اولین جملے میں ہے جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے یہ جملہ اتنا اچھوتا اور خوبصورت ہے کہ اس کی مدد سے بیکن نے اپنے نقطہ نظر کو بہت اچھے طریقے سے بیان کیا ہے۔ وہ بات سے بات نکالتے ہیں۔ مضمون کے پہلے حصے میں بیکن مافوق الفطرت عقائد کی بجائے غلط مذہبی عقائد پر بات کرتا ہے۔ اس کے بعد بے دین لوگوں کی وہ صفت سامنے لاتا ہے جو اس کے نزدیک قابل تحسین ہے۔ یعنی بے دین لوگ چونکہ کسی مذہبی گروہ یا عقیدے سے جڑے نہیں رہتے۔ لہٰذا مذہبی معاملات میں دخل نہ دینے کی پالیسی پر کاربند رہتے ہیں اور ریاست کے لیے خطرہ ثابت نہیں ہوتے۔

بیکن کے مطابق لادین لوگوں کی ایک صفت یہ ہے کہ چونکہ وہ سائنسی مکتبہ فکر کی پیروی کرتے ہیں لہٰذا دانش اور دنیاوی تعلیم کا مرقع ہوتے ہیں۔ آخر میں بیکن حسب معمول بدعقیدہ لوگوں پر تنقید کرتے ہوئے انہیں اس دنیا کے لیے خطرہ قرار دیتے ہیں۔ دیگر مضامین کی مانند اس مضمون میں بھی ہر بیان کے بعد دلائل پیش کرنے میں بیکن نے مہارت کا مظاہرہ کیا ہے۔

Of Innovation بیکن کا وہ مضمون ہے جس میں مذکورہ مصنف نے سائنسی ایجادات سے متعلق خیال آرائی کی ہے اور ایجادات کے معاشرے پر اچھے یا برے اثرات کا جائزہ پیش کیا ہے۔ بیکن کا مضمون انتہائی خوبصورت منضبط اور اچھے ذخیرہ الفاظ سے مزین ہے۔ مضمون کے شروع میں فاضل مصنف نے ان ایجادات کے اچھے یا برے اثرات پر بحث کی ہے۔ بیکن کا دور سائنسی ایجادات کے لحاظ سے سنہری دور تھا جس میں انگلستان دیہی اور غیر صنعتی نورعی معاشرے کو چھوڑ کر صنعتی ترقی کی جانب تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ ایسے میں جدید ایجادات کے نتیجے میں معاشرے میں اوتھل پوتھل اور ہیجان کا ظاہر ہونا قرین قیاس تھا۔ اس مضمون میں بیکن نے معاشرے کے اوپر ان ایجادات سے ہونے والے اثرات کا جائزہ پیش کیا۔ اولین حصے میں ایجادات کی نوعیت معاشرے پر ان کے اثرات صراحت سے بیان ہوئے ہیں جبکہ آخر میں مصنف نے ایجادات کے لیے معاشرتی قوانین میں اصلاح اور تبدیلی کے بارے میں غیر مبہم بات کی ہے۔ مضمون نہ صرف سائنسی انداز میں تحریر کردہ ہے بلکہ اپنی علمیت کا اظہار کیے بغیر بیکن نے نہایت خوبصورت زبان میں ایجادات کے بارے میں رویے کی تبدیلی کا ذکر کیا ہے۔ جس کا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ معاشرے کو ذہنی طور پر تیار کیے بغیر ایجادات واختراعات کو متعارف کرانا معاشرے میں ہیجان اور بے چینی کا سبب بنتا ہے۔ اس مضمون کے الفاظ عمل کی دعوت دینے والے اور نہایت ملائم محسوس ہوئے ہیں۔ طرز تخاطب بھی انفرادی کی بجائے کلی ہے۔ جس سے مضمون کی معنوی گہرائی اور تاثرات میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔

بیکن کے عام سادہ الفاظ بھی فلسفیانہ گہرائی لیے ہوئے ہیں۔

As the births of living creatures at first are ill-shapen, so are all innovations, whcih are the briths of time, yet

notuiths tanding, as these that first bring honour into their family are commonly more worthy than most that succeed, so the forst precedent is seldom attained loy imitation.[۸]

(جیسا کہ تمام زندہ مخلوقات ابتدا میں نامکمل اور کسی واضح شکل و صورت بے بغیر ہوتی ہیں ویسے ہی تمام تر ایجادات اور اختراعات کو کسی خاندان میں متعارف کروایا جاتا ہے تو وہ ضرورت کی بجائے اصراف کے زمرے میں داخل ہوتی ہیں لیکن آہستہ آہستہ انسانی طبعیت ان سے ہم آہنگ ہونا شروع ہو جاتی ہیں اور فطری طور پر انسان مشین کے رویے کے مطابق عمل کرنا شروع کر دیتا ہے۔)

Of Custom and Education بیکن کا مضمون ہے جس میں انسان کے قدرتی رجحانات نظریات اور تعلیم کے حوالے سے بحث کی گئی ہے۔ یہ مضمون بتاتا ہے کہ انسانی معاشرے میں رسوم ورواج کس قدر طاقت ور ہوتے ہیں کہ ایک تعلیم یافتہ شخص بھی مجبوری کے اتباع پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ اس مضمون میں بیکن لمبے مگر متناسب حصوں میں بٹے فقرات کی مدد سے اپنے مضمون کو بیان کرتا ہے۔ فقرات میں فلسفیانہ انداز، نفاست اور علمی وادبی سوچ نمایاں نظر آتی ہے۔ مضمون کے اولین حصے میں بیکن نے مختصر مگر جامع انداز میں رسوم ورواج کی اہمیت ان کی خرابیوں کے بارے میں بتایا ہے۔ بیکن کا انداز دوسرے حصے کے دلائل پر مبنی ہے۔ پہلے حصے میں رسوم ورواج کی وضاحت ہے جب کہ دوسرے حصے میں یہ بتایا گیا ہے کہ رسمیں کس طرح قائم ہوتی ہیں اور کس طرح انسان اس کے بندھن میں بندھ جاتا ہے۔ بحث کے آخر میں بیکن حسب معمول تجزیہ پیش کرتا ہے جو چند جملوں پر محیط ہوتا ہے۔ مگر اس میں پورے مضمون کی وضاحت ہوتی ہے اور مضمون میں بیان کردہ کوئی بھی نقطہ مضمون کے آخر میں بیان کیے گئے تجزیے کے علاوہ نہیں ہوتا۔ اس مضمون میں بیکن نے دولت مشترکہ میں شامل ممالک کی خراب رسوم کو بدلنے کی اہمیت پر بات کی ہے تاکہ اس طرح بہتر معاشرے کو قائم کر کے انسانوں کو سہولت دی جاسکے۔

Of Unity is Religion بیکن کا وہ مضمون ہے جس میں انسان کی مذہبی زندگی کو بحث میں لایا گیا ہے۔ بیکن کے مطابق مذہب انسانی معاشرے کا سب سے طاقتور روحانی عقیدہ ہے۔ یہ انسانوں کو جوڑے رکھنے یا تقسیم کرنے میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ اس مضمون میں بیکن نے مذہب کے اتحاد و یگانگت کے فروغ کے کردار پر بحث کی ہے۔ اس مضمون کا پہلا فقرہ مضمون کے بقیہ بحث کے بارے میں قاری کو آگاہ کرتا ہے۔

> Religion being the chief band of human society it is a happy thing when it is well contained within the true band of unity.[۹]
>
> (مذہب انسانی سماج کی سب سے خوش کن چیز ہے، بشرطیکہ اسے اس کے اصل معنوں میں اتحاد اور یگانگت کو بڑھانے کے لیے استعمال کیا جائے۔)

بیکن کا کمال یہ ہے کہ یہی ایک جملہ اتنا خوبصورت اور پر معنی ہے کہ اس کی مدد سے بحث کو دلیل در دلیل جاری رکھنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ یہ مضمون چونکہ انگلستان میں صنعتی ترقی کے عروج کے دور میں لکھا گیا ہے جس میں مذہب کی بنیاد سائنس اور فلسفے نے کمزور کر دی تھیں اور انسانوں کے مابین فرقوں کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کے مخالف ہو گئے تھے۔ بیکن کے لیے آزردہ کرنے والا تھا لہٰذا مضمون کے پس منظر میں ان کی ذہنی کشمکش کو سمجھا جا سکتا ہے۔ اس مضمون کے الفاظ مشکل مگر ملائمت لیے ہوئے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے مضمون کو لکھنے کی بجائے شعری صورت میں کہا گیا ہو۔ الفاظ سلات اور معنی خیزی لیے ہوئے ہیں۔ غیر ادبی، صحافتی یا بازاری زبان کے استعمال سے مکمل گریز کیا گیا ہے۔ مضمون کے آخر میں حسب معمول تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔

بیکن کے مضمون Of Negotiating میں مصنف نے خط و کتابت اور کاروباری و خاندانی امور کو معاہدوں کے انداز میں تحریر کرنے کی اہمیت پر بات کی ہے۔ حسب روایت ان کے مضمون کا پہلا فقرہ مضمون کے بقیہ حصے کی نمائندگی کے طور پر نظر آتا ہے۔

It is generally better to deal by speech than by letter, and by the maditation of a third than by a man's self.[۱۰]

(یہ عموماً بہتر رویہ ہے کہ کاروبار میں زبان کلامی بات کرنے کی بجائے خط کو معاملات طے کرنے کا ذریعہ بنایا جائے اور اس مقصد کے لیے تیسرے آدمی کو ضامن بنایا جائے۔)

انسان معاہدوں کے دوران میں بہت سارے امور فراموش کر دیتا ہے۔ لہٰذا لکھے ہوئے پر بات کرنا انسان کے لیے فائدہ مند رہتا ہے۔ چونکہ اس میں تمام امور تفصیل سے بیان ہوتے ہیں۔ مضمون کے پہلے حصے میں مسئلے کے بیان اور اہمیت پر جامع انداز میں بہت کی گئی ہے جب کہ اس کے بعد معاہدوں کی اہمیت اس کی افادیت، اس کے طریقہ کار، اس کے مقاصد اور اس کے انسانی استعمال پر بحث کی گئی ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ایک چالاک انسان زبانی کلامی معاہدوں سے کس طرح روگردانی کر سکتا ہے۔ یہ معاہدے انسان کی سمت کو درست کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ مضمون کے آخر میں اپنے تجربے میں معاہدوں کے غلط استعمال، انسانی چالاکیوں سے بچنے کے بارے میں اور معاہدوں کی نوعیت کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ بیکن پیشے کے لحاظ سے ایک وکیل اور قانون دان تھے۔ لہٰذا معاہدوں کے بارے میں ان کی باریک بینی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مگر ان معاہدوں کو کس طرح ایک فرق دوسرے کے خلاف استعمال کرتا ہے۔ اس بارے میں ان کا مضمون انتہائی جامع، مختصر مگر بہت معلوماتی ہے اور قانون سے نابلد شخص بھی اس سے کافی فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔

بیکن مضمون نویسی میں نہایت پختہ انداز کا حامل ہے۔ اس کے تمام مضامین یکساں سانچے میں ڈھلے ہوئے نظر آتے ہیں۔

Of honour and reputation بھی اسی طرح کا ایک مضمون ہے جس میں بیکن نے شہرت اور عزت کے بارے میں بات کی ہے۔ یہ مضمون اس بات پر بحث کرتا ہے کہ ایک انسان معاشرے میں کس طرح عزت اور شہرت حاصل کر سکتا ہے اور پھر اس شہرت عام کو اپنے فائدے کے لیے کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے، مضمون کا اولین نقطہ نظر کے بقیہ دیگر اجزا کی وضاحت کرنے میں ممکنہ حد تک مددگار ہے۔ جیسے:

The winning of honour is but the revealing of a man's virture and worth without disadvantage."

(عزت کا حصول اور نیکی کی شہرت کسی فائدے کے حصول میں مدد فراہم نہیں کرتی۔)

یہ مضمون انسانی نفسیات کے بارے میں بیکن کے گہرے مطالعے کا بین ثبوت ہے۔ یہ مضمون انسانی افعال اور اس سے پیدا ہونے والے نتائج کے بارے میں بتاتا ہے کہ جب کوئی شخص اپنے رد عمل میں سستی کا مظاہرہ کرتا ہے تو کس طرح اس کا یہ عمل دوسروں کی نظر میں اس کی ناکامی کا سبب بن جاتا ہے۔ معاشرے میں اپنی قدر بنانا اس کو قائم رکھنا اور اس میں اضافے کی کوشش کرنا ہر ایک کے لیے ناممکن ہوتا ہے مگر چند اشخاص غیر معمولی قابلیت نہ رکھتے ہوئے بھی صرف اپنے نشست وبرخاست اور گفتگو کے بل پر معاشرے میں اہم مقام حاصل کرنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ یہ مضمون چھوٹے چھوٹے جملوں پر مشتمل ہے۔ منطق پر مبنی اندازے اس کی خوبصورتی میں مزید اضافہ کر دیا ہے۔ اس مضمون میں تاریخی حوالے بیکن کے وسیع مطالعے کے گواہ ہیں۔ اس مضمون میں بیکن نے حکام وقت کو مشورے بھی دیئے ہیں۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس طرح کے معزز لوگوں اور نامور اشخاص کو کس طرح اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

بیکن کا مضمون Of Ambition بیکن کے ریاستی معاملات اور انسانی فطرت سے آگاہی کا عکاس ہے تاہم وہ اپنے مخصوص نظریہ افادیت کی بنا پر مکیاولوی کی ذہنیت کی بھی عکاسی کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کوئی چیز یا عہدہ حاصل کرنے کے لیے پیدا ہونے والا شدید جذبہ انسان کو سنجیدہ اور متحرک بنا دیا ہے لیکن اگر اس شخص کی خواہشات ناکام ہو جائیں تو وہ کمینگی پر اتر آتا ہے۔ بیکن چونکہ بادشاہت کے فروغ کے لیے بہت محترک تھا لہٰذا وہ اپنے مضامین میں بادشاہ کو مشورے دینے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ یہ مشورہ دیتا ہے کہ اس طرح کے شدید جذبے رکھنے والے انسانوں کو صرف ایمرجنسی یا عوامی مفاد کو مد نظر رکھتے ہوئے ملازم رکھا جائے۔ لیکن اس کے باوجود ان کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھنا بھی ضروری ہے کیونکہ بصورت دیگر وہ حکومت بالخصوص بادشاہ کے لیے ایک بڑا دردسر بن سکتے ہیں۔ وہ بادشاہ کو مشورہ دیتا ہے کہ بادشاہ کو اپنے درمیان ایسے افراد کو ضرور رکھنا چاہیے جو افہام و تفہیم کے ماہر ہوں تاکہ حالات کو غیر یقینی صورتحال میں سنبھالا جاسکے۔ بیکن کا

مضمون Of Ambition مختصر مگر جامع جملوں کا مجموعہ ہے جو کئی حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ الفاظ کی روانی ملائمت اور سلاست یہ بات ظاہر کرتی ہے کہ انہیں لکھنے اور لکھانے کے فن سے شدید الفت ہے۔ ان کا یہ مضمون معلومات کے ساتھ ساتھ قارئین کے اندر ایک خاص قسم کی ادبی خوبصورتی پیدا کرنے کا بھی باعث بنتا ہے۔ الفاظ کی نشست وبرخاست میں ترتیب جلترنگ کا احساس پیدا کرتی ہے۔ اس میں موجود فلسفیانہ گہرائی اور ظاہری خوبصورتی کے بارے میں یہ بتانا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس پہلو کو زیادہ اہمیت دی جائے اور کس کو کم اہم گردانا جائے۔

اس مضمون کا پہلا جملہ سابقہ جملوں کی مانند اچھوتا اور معنی خیز ہے۔

Ambition is like choler, which is a humour that maketh men actue eamest, full of alacrity and stirring.[۱۲]

(عزم جزم یا ارادہ ایک ایسا جذبہ ہے جو ایک مزاج کی مانند انسان کو خوش رکھتا ہے تو دوسری جانب رہنے میں بھی مدد دیتا ہے۔)

مذکورہ جملہ مضمون کے بقیہ دیگر حصوں کی اچھی طرح وضاحت کر دیتا ہے۔ جس سے بیکن کی مہارت اور ذہنی ہم آہنگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات جب کوئی مضمون نگار مضمون تحریر کرتا ہے تو نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا انداز وضاحتی اور اپنے مقصد سے ہٹا ہوا نظر آتا ہے مگر بیکن کی خوبی یہ ہے کہ آغاز سے اختتام تک اس کا انداز یکساں، متوازن، مختصر اور جامع رہتا ہے۔ اس میں کسی قسم کی بھی کوتاہی کا امکان نہیں ہوتا۔ بیکن کا انداز ادیب سے زیادہ ایک ریاضی دان یا انجینئر کا ہے جو ہر جملے کو پڑھ کر لکھتا ہے، اور اس میں موجود غلطیاں ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ Of Ambition فلسفے سے زیادہ سیاست کے بارے میں بحث کرتا ہے۔ یہ حسب روایت انسانی نفسیات کی ایک اہم مگر صرف نظر کیے ہوئے پہلو سے متعلق ہے۔

بیکن کا مضمون Of Wisdom for Man's Self خود غرضی اور رحم دلی کے بارے میں بیکن کے تصور کی وضاحت کرتا ہے، بیکن اس مضمون میں بتاتا ہے کہ بعض اوقات انسان اپنے لیے آسانی تلاش کرتا ہے مگر درحقیقت وہ دوسرے انسانوں اور مخلوقات کے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ بیکن کے مطابق

انسان رویہ یا دانائی صرف اپنے فائدے تک محدود نہیں رہنی چاہیے بلکہ استفادے کا دائرہ کار زیادہ سے زیادہ انسان اور معاشرتی طبقات تک پھیلا ہونا چاہیے، کیونکہ معاشرے کے لیے بہتر انسان وہی ہوتا ہے جو ذاتی فائدے کے ساتھ عوامی فائدے کے لیے بھی کوشش کرے۔ بیکن کے مطابق صرف اپنے ذاتی فائدے تک محدود رہنا انسانی کم ظرفی کو واضح کرتا ہے، انسان کے لیے بہتر یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ معاشرتی طبقات کو اپنے فائدے میں شامل کرے کیونکہ معاشرے کا اصول ہے کہ جب آپ زیادہ لوگوں کو اپنے نفع نقصان میں شریک کرتے ہیں تو دوسرے بھی آپ کو فائدہ دینے سے نہیں ہچکچاتے۔ بیکن کا مضمون حسب روایت طویل جملوں اور پر معنی مستقبل الفاظ سے عبارت ہے۔ ان کے طویل جملوں میں اتنا ربط موجود ہے کہ کسی حصے کو الگ کر کے جملے کے پورے معنی سے آگاہی حاصل کرنا ممکن نہیں۔ بیکن مضمون کی ابتدا میں کہتے ہیں:

> An ant is a wise creature for itself, but it is a shrewd thing in an orchard or garden.[۳]
>
> (چیونٹی نہایت عقل مند مخلوق ہے مگر صرف اپنے لئے کیونکہ اپنے مقصد کے لیے تمام باغ کو تباہ کر دیتی ہے۔)

بیکن کے مطابق جب انسان صرف اپنے ذاتی فائدے کے لیے سوچتا ہے تو اس کی حیثیت ایک نور بے مایہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ بیکن کا مذکورہ جملہ ان کے ذہن اور نقطہ نگاہ کی شفافیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اپنی محبت میں اندھے سیاست دان، جنرلز اور کاروباری حضرات جب زندگی کے اس موڑ پر آتے ہیں جب انہیں کسی کی ضرورت ہوتی ہے تو کبھی ان کی مدد کو نہیں آتا کیوں کہ اپنے عروج کے دور میں اپنے کم حصے پر رضامند ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔

مذکورہ مضمون نکات کی مدد سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے اس مضمون میں بقیہ دیگر مضامین کی مانند فلسفے کی مدد سے بات سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بیکن نے ایک ناصح کی ذمہ داری قاری پر چھوڑ دی ہے۔ ان کا مضمون عمومی نقطہ نظر کو خاص طرح کی خوبصورتی عطا کرتا ہے۔ انداز نگارش میں خوبصورتی کے ساتھ ساتھ

خطابیہ انداز زیادہ نمایاں ہے۔ بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ بیکن نے ایک چارٹ بورڈ پر کسی مرحلے کو نکات کی مدد سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ یہ انداز تفہیم کے ساتھ ساتھ دل لبھانے میں بھی معاون ہے۔

مجموعی جائزہ:

سولہویں صدی کا دوسرا نصف یورپ میں سائنسی ترقی کا نقطہ آغاز ہے۔ بیکن اسی دور میں انگلستان میں پیدا ہوا۔ یہ دور چند وجوہات کی بنا پر موجودہ اور پہلے کے یورپ کے مقابلے میں فرق رکھتا ہے۔ پندرھویں صدی تک یورپ کے بیشتر ممالک بشمول انگلستان، فرانس اور جرمنی میں چرچ یا کلیسا بے حد طاقت ور حیثیت کا حامل تھا۔ اس دور میں انگلستان میں قائم ہونے والی درسگاہوں کی بدولت انگریزوں نے تعلیمی ترقی کا ایک نیا دور دیکھا۔ اسی دور میں قائم ہونے والی یونیورسٹیوں نے آج تک دنیا میں اپنی علمی وادبی ثقافت کی دھاک قائم رکھی ہے۔ جوں جوں تعلیم اور صنفت میں ترقی کی، فلسفے اور سائنس کی بنیادوں نے لوگوں کو ذہنی طور پر بیدار کرنا شروع کر دیا۔ انگلستان میں ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں ایک عظیم بحری قوت قائم ہوئی۔ اس بحری قوت نے رفتہ رفتہ دنیا کے بیشتر ممالک کو انگریزی نو آبادیات میں تبدیل کر دیا۔ چرچ کی مذہب پر گرفت کمزور پڑتے ہی جہاں سائنس و فلسفے کو نئی ترقی حاصل ہوئی وہاں مذہب سے بیزاری اور عقل و منطق کی بنیاد پر بات کرنے کے رجحان کو فروغ ملا۔ نو آبادیاتی نظام کے فروغ پاتے ہی دنیا کے معدنی اور زرعی وسائل کا رخ انگلستان کی طرف ہو گیا۔ انجمن سازی باوجہ باقی اور شیشہ سازی میں ترقی کرتا چلا گیا۔ انگلستان میں تیار ہونے والی یہ مصنوعات برصغیر اور دنیا کی دیگر منڈیوں میں گراں قیمت پر فروخت ہوتی تھیں۔ اسی طرح انگریز نو آبادیات کاروں نے دو طرح سے مقامی لوگوں کا استحصال کیا۔ ڈاک اور ریل کے نظام کے ذریعے صنعتی خام مال کی انگلستان کی صنعتوں تک بروقت رسائی اور وہاں کی مصنوعات کو برصغیر اور دیگر دنیا میں اپنے مال کے طور پر بیچنے میں انگریز سرمایہ داروں نے اپنے تاجرانہ ذہن کا خوب استعمال کیا۔ استحصال کا دوسرا طریقہ ایک ہی قوم سے تعلق رکھنے والے دو گروہوں کو ایک دوسرے کے خلاف صف آرا کر کے سیاسی و معاشی بالادستی کے علاوہ اپنے اسلحے کو فروخت کرنے میں انگریزی تاجروں نے نہ صرف سیاسی مقاصد کو حاصل کیا بلکہ معاشی طور پر بھی مضبوط ہوئے۔ بیکن نے انگریز سرکار کے ان نامور تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی جو پوری قوت سے

انتہائی قلیل تعداد میں موجود انگریز لوگوں کو دنیا پر تسلط جمانے کے لیے کام کر رہی تھی۔ ایسے میں ہر دم آئی جدت نے مذہب پر انگریز قوم کی گرفت میں نمایاں کمی کر دی۔ انگریزوں کے پاس مذہب پر عمل کرنے کی بجائے صرف مذہبی انتہا پسندی رہ گئی۔ جس کی بنیاد پر مقبوضہ ممالک میں مشنری ادارے قائم کیے گئے۔ وسائل کی کثرت نے جہاں بادشاہ کو مضبوط بنایا وہاں عوام کو ایسے جم غفیر میں بدل دیا۔ جنہیں بجز دوسری اقوام کو لوٹنے اور مار دھاڑ کر ان کے مال واموال پر قبضہ کرنے کے علاوہ کچھ پتا نہ تھا۔ سوسائٹی میں اخلاقی اقدار کی پیروی میں کمی، جھوٹ اور منافقت ان کے اپنے معاشرے میں بھی سرائیت کر چکی تھی۔ اس لیے بیکن کے مضامین اس وقت کے حالات کا مکمل جائزہ پیش کرتے ہیں۔ ہم چند نکات کی مدد سے بیکن کے مضامین کا معاشرتی، سیاسی اور سماجی منظر نامہ ترتی بدے سکتے ہیں۔ اول یہ کہ جوں کہ یہ دور افراتفری، ایک دوسرے کے حقوق کی پامالی اور بادشاہ کے زیادہ سے زیادہ قربت کو اچھا سمجھتا تھا۔ اس لیے بیکن کے مضامین میں منطق کے ساتھ ساتھ مکاری اور دنیاوی فائدے کی بات زیادہ نظر آتی ہے۔ دوم یہ کہ بیکن نے کہیں بھی اپنے مضامین میں روحانی خوشی یا روحانیت کے فروغ سے متعلق بات نہیں کی۔ صرف اور صرف مادی فائدے کو مد نظر رکھا لہٰذا انگریز معاشرہ مکمل طور پر مادہ پرست ہو چکا تھا اور سوم یہ کہ بعض مضامین میں زبانی کلامی بات کرنے کی بجائے عدالت کو ثالث کے طور پر متعارف کروانے کی کوشش کی۔ بیکن کی یہ بات مکر وفریب اور منافقت اور جھوٹ میں اضافے کی بنیاد مضبوط ہونے کی جانب پختہ اشارہ ہے۔

چہارم یہ کہ مذہب جب روحانیت کی بجائے محض رسوم کے ادا کرنے کا نام ہو جاتا ہے۔ تو منطقی طور پر تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے مذہب کی نفرت میں اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ وہ مذہب کو مانتے ہوئے بھی مذہبی طبقے کے لیے اپنی شدید نفرت پوشیدہ رکھتے ہیں۔ رسوم ورواج اور توہمات پر مبنی موضوعات رکھنے والے بیکن کے مضامین ان کی اسی سوچ کے غماز ہیں۔

پنجم یہ کہ صنعتی ترقی کی بدولت لوگوں کے پاس وقت کی کمی ہو گئی تھی۔ جنگلوں کے کٹاؤ، آلودگی اور رویوں میں گرم جوشی کی کمی ایسے عوامل ہیں جن کا ذکر حساس شاعروں بالخصوص William Words Worth کی شاعری میں نمایاں نظر آتا ہے۔ بیکن نے اگرچہ William Words Worth کی مانند فطرت

سے لگاؤ اور وقت کی کمی کا نعرہ نہیں بلند کیا مگر ان کے انتہائی جامع اور مختصر انداز میں بات کرنا اور اسی انداز کے فروغ کی حمایت کرنا دراصل Word Worth کے اس پہلو کی مانند اشارہ کرنا ہے کہ اب لوگ صرف دوٹوک بات کرنا چاہتے ہیں۔ فضول سے معنی کے لیے ان کے پاس وقت نہیں ہوتا اور آخر الذکر یہ کہ سیاسی فائدے کی حمایت مادی فوائد کے حصول کے لیے بنیادی شرط کی حیثیت رکھی۔ اس لیے زیادہ تر ادیبوں نے اپنی نگارشات میں بادشاہ کی پسند وناپسند کو پوری اہمیت دی۔ یہ چند عوامل بیکن کے مضمون نگاری کے فن کی پوری تاریخ بیان کرتے ہیں۔

حوالہ جات

1. Sir Francis Bacon' Bacon Essays, Published by New Kitaab Mahal & Urdu Bazaar Lahore Pakistan, First Edition, 1975, P. 359
2. Ibd, P. 327
3. Francis Bacon, Selected Essays, Published and Made by New Kitaab Markaz, 17 Urdu Bazaar Lahore, Edition 2017-18, P. 267
4. Ibd, P. 261
5. Ibd, P. 300
6. Ibd, P. 293
7. Ibd, P. 327
8. Ibd, P. 346
9. Ibd, P. 285
10. Ibd, P. 265
11. Ibd, P. 172
12. Ibd, P. 229
13. Ibd, P. 260

باب چہارم:

فرانسز بیکن اور سر سید احمد خان کے مضامین کا تقابل

الف) موضوعات کا تقابلی جائزہ:

سر سید احمد خان مسلمانوں کے وہ پہلے باقاعدہ راہنما ہیں جنھوں نے انگریزوں کی تعلیمی ترقی دیکھ کر تبدیلی نصاب سمیت بہت سارے دیگر عوامل کو مسلمان معاشرت کا حصہ بنانے کی کوشش کی۔ جن روایات کی بنیادیں اس سے قبل برصغیر کے معاشرے میں موجود نہ تھیں مسلمانوں کی ذہنی نشوونما اور اپنا نقطہ نظر مسلمانوں تک پہنچانے کے لیے سر سید نے سفر و حضر اور تقریروں سمیت اپنے زور قلم سے خوب کام لیا۔ ان کی یہ کوششیں اتنی ہمہ پہلو اور ہمہ گیر تھیں کہ ان کی ابتدائی کوششوں اور تحریروں پر روایت پسند سیاسی راہنماؤں اور علماء نے خوب انکشاف نمائی کی۔ تاہم تمام تر تنقید اور رکاوٹوں کے باوجود سر سید تحریک اپنے بہت سارے مقاصد کے حصول میں کامیاب رہی۔ سر سید احمد خان کٹر مذہبی علماء کی مانند انگریزی تعلیم کے یکسر مخالف نہ تھا بلکہ وہ اس تعلیم کے مثبت پہلوؤں سے ہندوستانیوں بالخصوص مسلمانوں کو روشناس کرانا چاہتا تھا۔ اسی پہلو کو مد نظر رکھتے ہوئے سر سید احمد خان نے دورہ انگلستان کے دوران انگریزی نظام تعلیم اور کتب خانوں پر عمیق نظروں سے جائزہ لیا اور پھر ہندوستان واپس آ گئے۔ ان پہلوؤں کو قابل عمل بنانے کے لیے سعی شروع کر دی۔ سر سید احمد خان دیگر شعرا اور ادیبوں کی مانند ادب دوست واقع ہوئے لیکن وہ ادب برائے ادب کی بجائے ادب برائے افادہ کے قائل تھے اور اسی وجہ سے انھوں نے اردو نثر کی ترویج کے لیے فارسی اصطلاحات اور شعری علامات نثر میں استعمال نہ کرنے کی ٹھانی۔ ان کے مضامین میں بسا اوقات دلچسپ واقعات اور تجربات کی تصویر کشی دکھائی دیتی ہے مگر انھوں نے اکثر اوقات نثر کو اس قدر سادہ اور پھیکا بنا دیا تھا کہ نصیحت آموز باتوں اور اپنے منصب تک محدود رہنے کی ان کی باتیں ادب کی عمومی سطح سے نیچے دکھائی دیتی ہیں۔ سر سید احمد خان عربی و فارسی کے علاوہ بے شمار دیگر علوم اور مختلف زبانوں کے ادب سے کماحقہ آگاہ

تھے۔ مگر مسلمانوں کی تربیت اور ناخواندہ غریب طبقے کی اپنی بات پہنچانے کے لیے انھوں نے دانستہ نثر میں انتہائی سادگی اور جامعیت اختیار کرنے کی شعوری کوشش کی۔

بیکن کے مضامین اور ان کے مضامین کا تقابلی جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ سرسید اپنی گوں ناگوں مصروفیات کے باوجود انگریزی ادب سے آگاہی حاصل کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔ تقابلی جائزہ لینے سے پہلے اس بات کی وضاحت لینا ضروری ہے کہ سرسید احمد خان ایک عالم وفاضل شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بامقصد زندگی گزارنے کے قائل تھے۔ لہٰذا انھوں نے اپنی زندگی مسلمانوں کا سیاسی وسماجی قبلہ درست کرنے سمیت انہیں اس میدان میں کمال حاصل کرنے کی ترغیب دی۔ برصغیر کے کروڑوں لوگوں کی زندگی میں انقلاب برپا کرنے کا سفر اتنا دشوار گزار اور صبر آزما تھا کہ انھوں نے اپنی ذاتی خوشیاں اور فراغت کے لمحات قوم وملت کے نام کر دیئے۔ لہٰذا مضامین کا تقابل لینے کے دوران جو پہلی اور نہایت اہم خصوصیت ہر دو مضامین نگاروں کے مضامین سے واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ سرسید احمد خان انگریزی زبان وادب کے دلدادہ ضرور تھے مگر دیگر بہت سارے مسلمانوں کی مانند ان کا مطالعہ انگریزی ادب میں نہایت کم تھا۔ لہٰذا ان کے مضامین سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مضامین تحریر کرتے ہوئے سرسید نے بیکن کے مضامین کے عنوانات کا ترجمہ کرنے کی کوشش کی مگر مضامین کے درمیان لکھے جانے والے مواد میں فرق بہت زیادہ ہے۔ ان کے مضامین کو اگر ترجمہ شدہ مضامین کا درجہ دیا جائے تو یہ ترجمہ طبع زاد ہوگا اور اگر ترجمہ کی حیثیت نہ دی جائے تو عنوانات کے علاوہ نفس مضمون مختلف ہے۔ سرسید احمد خان کا تعلیمی، لسانی اور تہذیبی پس منظر بیکن سے مختلف ہے۔ لہٰذا ان کے تجربات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ بیکن نے سرسید کے برعکس ادب برائے ادب کے لیے کام کیا جبکہ اس کے برعکس سرسید کا نقطہ نظر ادب برائے افادہ تھا۔ لہٰذا مضمون لکھتے وقت ان کے ذہنی پس منظر اور مقاصد کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

سرسید کا مضمون عنوان کے لحاظ سے بیکن کے مضمون Of Ambition کا ترجمہ ہے۔ مضمون کا مواد جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے مختلف ہے۔ بیکن نے اس مضمون میں اپنے گہرے مشاہدے اور سیاسی سمجھ بوجھ سے کام لیا ہے۔ بیکن کا مضمون اعلیٰ ترین نظم وضبط کے ساتھ ساتھ بہترین الفاظ کے انتخاب کا نمونہ پیش کرتا ہے۔

اس میں بیکن نے عام لوگوں کے ساتھ ساتھ بادشاہوں کو مختلف مشورے دیئے ہیں۔Ambition انگریزی میں جذبے کی اس شدید حالت کو کہتے ہیں جس میں انسان ہمہ وقت متحرک سنجیدہ اور سبک رفتار ہوتا ہے۔ مذکورہ مضمون میں بیکن نے بادشاہوں کے متحرک اور جذبے سے بھرپور افراد سے کام لینے کے طریقوں پر بحث کی ہے۔بیکن مقتدر طبقے کو مشورہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ

> There is also great use of Ambitious men in being screens to princes in matters of danger and envy; for no man will take that part, except he be like a seeled dove. That mounts and mounts because he cannot see about him. There is use also of ambitions men in pulling down the greatness of any subject that overtops; as Tiberius used Macro in pulling down of Sejanus.[1]

سرسید احمد خان کا نقطہ نظر اور مضمون کا مواد بیکن سے یکسر مختلف ہے۔ اس نے اپنے مضمون میں نظام تعلیم اور حصول تعلیم کے مدارج اور بنیادوں پر بحث کی ہے۔ البتہ بیکن کی طرح سرسید کا مضمون بادشاہوں کے ذکر سے خالی نہیں ہے۔ لیکن سرسید نے متعدد طبقے کو مشورہ دینے کی جرات نہیں کی۔ البتہ بادشاہوں کا مختصر تعارف کیا ہے۔اس میں بھی ان کا نقطہ نظر بادشاہوں کے علم اور تعلیم کے حوالے سے ہے۔ سرسید بادشاہت اور اقتدار کے تقاضوں پر بات نہیں کرتے بلکہ نصیحت آموز انداز میں تخاطب کے انداز میں کہتے ہیں کہ:

> دنیا میں بہت بڑے بڑے بادشاہ گزرے ہیں۔ جنھوں نے عظیم الشان فتوحات حاصل کی ہیں۔ دنیا میں بہت بڑے بڑے ذی علم گزرے ہیں جن سے دنیا نے بے انتہا فائدہ حاصل کیا ہے۔ دنیا میں بہت بڑے بڑے ریفارمر گزرے ہیں جنھوں نے اپنی قوم کی بھلائی واصلاح میں اپنی جانوں کو بھی ضائع کیا ہے۔ دنیا میں ایسے بے رحم اور قاتل سفاک غارت گر گزرے ہیں جنھوں نے ایسے ایسے بے رحم کام کیے جن کو سن کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔[2]

Of Ambition میں بیکن نے ذاتی مشاہدات اور تجربے کی بنیاد پر باتیں کی ہیں اور کسی مفکر یا مذہبی کتاب سے کوئی بات نقل نہیں کی۔ تاہم اس کے برعکس سرسید نے مغربی مفکرین خاص طور پر مشہور انگریزی ناول نگار کی بات بطور دلیل پیش کی ہے۔ بعض اوقات سرسید کسی فلسفی کی بات کو درج کر کے اس سے اتفاق کرتے ہوئے اپنی بات کو آگے بڑھاتے دکھائی دیتے ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس بیکن نے ہر قسم کے اقوال اور حوالہ جات کے ذکر سے مکمل گریز کیا ہے۔ تاہم یہ بات واضح طور پر دیکھی جاسکتی ہے کہ بیکن نے سرسید کے برعکس اپنی بات زیادہ عمدہ اور مکمل طریقے سے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ سرسید اپنی بات کے ساتھ وضاحتیں دینے اور اپنے مشاہدے کو مدلل ثابت کرنے کی کوشش میں ہر جگہ مصروف دکھائی دیتے ہیں۔

عام طور پر Superstition سے مافوق الفطرت چیزوں پر اعتقاد رکھنے کے معنی اخذ کیے جاتے ہیں لیکن بیکن نے اپنے مضمون Of Superstition میں غلط قسم کے مذہبی عقائد پر بحث کی ہے۔ یہ بات ہم سب کو معلوم ہے کہ کیتھولک اور پروٹیسٹنٹ عیسائی مذہب کے بہت سارے فرقوں میں سے مشہور فرقے ہیں۔ بیکن اعتقاد کے لحاظ سے ایک Protestant عیسائی تھا مگر اپنے مضمون میں اس نے کیتھولک اور پروٹیسٹنٹ مذہب کا تقابل کرنے یا ایک اعتقاد کو دوسرے سے بدتر ثابت کرنے کی قطعن کوئی کوشش نہیں کی بلکہ بیکن یورپ میں موجود ان لوگوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتا ہے جو غلط مذہبی عقائد کی وجہ سے مختلف قسم کے توہمات اور غیر سماجی روایات اپنی زندگی میں شامل رکھے ہوئے ہے۔ کیتھولک مذہب کے بعض اعتقادات پروٹیسٹنٹ اور عمومی رویے کے برعکس غیر سماجی اور انسانی معاشرے کے لیے ہلاکت خیز ثابت ہوئے۔ یہی وجہ تھی کہ یورپ میں کیتھولک پادریوں کے مظالم جب حد سے بڑھنے لگے تو ایک نیا مذہبی عقیدہ وجود میں آیا جو پروٹیسٹنٹ کے نام سے معروف ہے۔ بیکن کہتا ہے کہ خدا کے بارے میں غلط عقیدہ رکھنا اور اس کی وجہ سے غیر سماجی روایات کا حامل ہونا خدا کے وجود پر یقین نہ رکھنے سے برا اور مکروہ ہے۔ بیکن اپنے مشاہدے کی بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اگرچہ خدا کے وجود سے انکاری ہونا قابل اعتراض ہے لیکن بے دین لوگوں کی ایک خاص صنف یہ بھی ہے کہ وہ متفقہ طور پر اپنے عقیدے کے پیروکار ہوتے ہیں۔ لادین لوگ چونکہ دلیل اور مطالعے کی بنیاد پر خدا کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔ لہٰذا مذہبی عقائد سے قطع نظر معاشرے میں ان کا کردار

مثبت اور قابل عمل ہوتا ہے۔ جبکہ بیکن کے مطابق غلط عقیدہ رکھنے والے افراد باشعور نہیں ہوتے بلکہ اپنی بدعقیدگی کے سبب اپنی شخصی خوبیوں سے کنارہ کش ہو جاتے ہیں۔ بیکن کے خیال میں لادین لوگ کسی بھی معاشرے یا ریاست کے لیے خطرے کا باعث نہیں۔ بیکن کہتا ہے کہ:

> Atheism leaves a man to sense, to philosophy, to natural piety, to laws, to reputation: all which may be guid to an autwards moral virtue, though religion were not; but superstition dismoupts all these, and erecteth an absolute mon archy in the minds of men. Therefore Atheism did never perturb states; for it makes men wary of themselves, as looking no further; and we see the times indined to atheism (as the times of Augustus Caesar) were civil tines.[۳]

سرسید نے اپنے مضمون تعصب میں بیکن کی طرح بدعقیدت ہونے کی مختلف خرابیوں کو بیان نہیں کیا بلکہ سرسید کا نقطہ نظر بیکن سے مختلف ہے۔ اس مضمون میں سرسید کا نقطہ نظر مختلف ہونے کے باوجود ہر دو مضمون نگاروں کا موضوع کم و بیش ایک ہی ہے۔ سرسید نے اپنے مضمون میں مذہبی تعصب رکھنے والے افراد، علما اور مشائخ پر زور مذمت کی ہے۔ اپنے مضمون کو مدلل بنانے اور لوگوں کو سمجھنے کی غرض سے سرسید اس مضمون میں اقوال ذریں کے علاوہ احادیث مبارکہ اور اشعار سے مدلل بنایا ہے۔ جس کی وجہ سے مضمون نہ صرف مدلل نظر آتا ہے۔ بلکہ اس کی آزمائش میں کئی گنا اضافہ، ہم آہنگی اور اقوال ذریں کی وجہ سے بھی ہے۔ سرسید نے مذہبی تعصب کو اخلاق اور علم وہنر کے لیے ہم قاتل معنون کیا ہے۔ بیکن کی مانند سرسید نے تعصب پسندی اور اس کی وجوہات پر بحث کی ہے جو اس وقت کی ضرورت تھی۔ امروزہ حالات برصغیر کے لوگوں بالخصوص مسلمانوں کے لیے اس وقت کے حالات کم خطرناک اور بدتر ہیں۔ اس مضمون میں سرسید نے احادیث مبارکہ کے ساتھ مسدس حالی کے اشعار کو بھی اپنے مضمون کا حصہ بنایا۔ ان کا یہ انداز نیا نہیں مگر اس کے ساتھ ان کی زبان نہایت سادہ اور سلیس ہے۔ آخر میں سرسید نے تمام مسلمانوں سے اپیل کی ہے کہ وہ

مذہبی تعصب کو بالائے طاق رکھ کر اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کریں۔ اپیل کا یہ طریقہ اس وقت کے حالات کے متقاضی تھا مگر یہ طریقہ بیکن نے اپنے مضمون میں بھی استعمال نہیں کیا بلکہ بیکن نے ہمیشہ اپنے مضمون میں اچھے اور برے پہلوؤں کو قاری کے سامنے بیان کیا ہے۔ نتیجہ اخذ کرنے کی ذمہداری قاری پر چھوڑ دی۔ علم و فن اور ہنر کا حصول سرسید کے نزدیک اعلیٰ ترین مقاصد اور اعمال صالحہ میں سے ہے۔ وہ اپنے آپ کو پہچاننے کے لیے اور دنیا میں آنے والے نت نئی ایجادات اور تبدیلیوں سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنے کے لیے علم و فن کے حصول کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ البتہ تعصب ان کے نزدیک وہ بلا ہے جو علم و فن اور ہنر کے سیکھنے میں انسان کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس سدراہ کو راستے سے ہٹانے کے لیے مذہبی تعصب کو بالائے طاق رکھنا ایک مسلمان کے لیے امر لازم ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

> ہنر اور فن اور علم ایسی عمدہ چیزیں ہیں کہ ان میں سے ہر ایک چیز کو نہایت اعلیٰ درجے تک حاصل کرنا چاہیے۔ مگر متعصب اپنی بدخصلت سے ہر ایک ہنر اور فن اور علم کے اعلیٰ درجے تک پہنچنے سے محروم رہتا ہے۔[۴]

سرسید اور بیکن کے مذکورہ مضامین کا تقابلی جائزہ لینے سے معلوم پڑتا ہے کہ سرسید اور بیکن نے ہر دو مضامین میں نہایت اعلیٰ افکار کو پانے مذہب اور معاشرت کے تناظر میں پیش کیا ہے۔ لیکن سرسید نے بیکن کے مضامین کو زیادہ گہرائی کے ساتھ مطالعہ نہیں کیا۔ لہٰذا موضوع کی یکسانیت کے باوجود مواد اور نقطہ نظر میں فرق صاف دکھائی دیتا ہے۔

بیکن نے اپنے مضمون Of Envy میں جذبہ رشک وحسد کے بارے میں بحث کی ہے۔ سرسید احمد خان نے اسی موضوع پر مخالفت کے عنوان سے تہذیب الاخلاق میں ایک مختصر مضمون تخلیق کیا۔ ہر دو مضامین میں کچھ بحثیں یکساں ہیں جبکہ بعض دیگر میں سرسید احمد خان اور بیکن کے طرز تحریر اور سوچوں میں فرق نظر آتا ہے۔ سرسید احمد خان ہر چند بیکن کی پیروی میں مذکورہ مضمون تخلیق کیا ہے۔ لہٰذا بہت سارے دیگر تفرقات کی مانند مقصدیت کا فرق اس میں بھی واضح نظر آتا ہے۔ سرسید احمد خان چاہتے ہوئے بھی نصیحت آموز واقع اور اپنے موقف پر جمے رہنے سے باز نہیں آتے جبکہ بیکن کے ہاں یہ طرز عمل مفقود ہے۔ بیکن انسانی نفسیات کا انتہائی گہرا مطالعہ رکھتا ہے۔ اسی سبب مضمون تحریر کرتے ہوئے بیکن نے لوگوں کی اقسام

گنوانے کے ساتھ ساتھ جذبہ حسد کی شدت کو ماپنے کا بہترین پیمانہ پیش کرتا ہے۔ اس کے برعکس سرسید احمد خان مضمون کو تحریر کرتے وقت گنجلک ذہن کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ان کی تحریر میں عجلت اور سادگی کچھ اس طرح باہم مل گئی ہیں جس نے ان کے انداز تحریر کو مبہم بنا دیا ہے۔ سرسید کے برعکس بیکن کا انداز انتہائی منضبط ہے جس میں الفاظ کے انتخاب کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ گہرائی لازم وملزوم ہے۔ بیکن نے مضامین تحریر کرتے ہوئے غیر جانبداری کو مکمل طور پر مد نظر رکھا۔ سرسید غیر جانبدار نہیں رہ سکے۔ کیونکہ وہ خالصتاً مضمون نگار نہ تھے بلکہ ایک تحریک کے روح رواں تھے۔ لہٰذا یہ بات کہتے ہوئے مقصد کو مد نظر رکھنا اس کی مجبور تھی۔ ایک واضح فرق وہ ہمیں دونوں افراد کی سوچوں میں نظر آتا ہے۔ وہ یہ کہ بیکن نے اپنے مضمون میں بادشاہوں کو مشورہ دینے کے ساتھ ساتھ طبقہ اشرافیہ کی ذہنی حالت کی منظر کشی کی ہے۔ جبکہ سرسید مسلمان قوم کی تربیت کے لیے مضمون کو بطور آلہ استعمال کر رہے تھے۔ لہٰذا سوچ کے فرق نے اندازِ تحریر کے ساتھ ساتھ مضمون کے موضوع پر اثر ڈالا ہے۔

> Deformed persons and euncuchs, and old men, and bastards, are envious. For he that cannot posibly mend his own case, will do what he can to impair other's except these defects light upon a very brave and heroical nature, which thinketh to make his natural want part of his honour; in that it should be said that an eunuch.[۵]

اس کے برعکس سرسید احمد خان حسد اور رشک کے جذبے کی مبادیات سے بحث نہیں کرتے بلکہ وہ ان اشخاص کی بابت بتاتے ہیں جو ایسا طرز عمل اختیار کرتے ہیں۔ مضمون کے آخر میں التجا آمیز اور تاسف پر مبنی رویہ بھاری بھر کم اور بے زار کن ثابت ہوتا ہے۔ مضمون کے آخر میں وہ کہتے ہیں کہ:

> ہم کو بڑا افسوس ہے کہ ہمارے مخالف اس پچھلے طریقے پر ہم سے مخالفت کرتے ہیں۔ ہم کو اپنی مخالفت کا یا اپنے پر اہتمام کرنے کا یا اپنی بدنامی کا کچھ اندیشہ نہیں ہے۔

بلکہ اس بات کا افسوس ہے کہ انجام تو ہمارے مخالف ہی رسوا و بدنام ہوتے ہیں اور
دنیا انہی کو دروغ گو کذاب قرار دیتی ہے۔[۲]

سرسید زود نویس مشہور ہوئے تھے۔ لہٰذا زود نویسی نے الفاظ کی بندش اور مضمون کی کمیوں کجیوں کی طرف دھیان نہیں رہتا۔ دوسری بات یہ کہ سرسید نے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے جس تیزی سے کام کیا وہ لائق تقلید ہے کیونکہ اس سے قبل انشانویسی کا قابل ذکر نمونہ ان کے سامنے اردو ادب میں موجود نہ تھا۔

بیکن کا مضمون Of Innovations سائنسی ایجادات سے پیدا ہونے والی معاشرتی تبدیلیوں کے تذکرے پر مبنی ہے۔ بیکن کے مطابق انسان کے ماضی سے جڑے رہنے کو زیادہ اچھا سمجھتا ہے اور جدید ایجادات کو بخوشی قبول نہیں کیا جاتا۔ بیکن کا مضمون اس بات پر مبنی ہے کہ بیسویں صدی میں سائنسی ایجادات اور ترقی کی شرح اتنی زیادہ رہی ہے کہ اس کے نتیجے میں ہونے والی ایجادات کو انسانی معاشروں میں بخوشی قبول کرنے کی بجائے بروقت اور بامر محال قبول کیا گیا۔ بیکن کہتا ہے کہ سائنسی ایجادات کو معاشرے میں متعارف کروانے سے پہلے سیاسی بنیادوں پر اصلاحات کی ضرورت باقی رہتی ہے۔ سرسید احمد خان کا مضمون علوم جدیدہ بیکن کے مضمون Of Innovations کی پیروی میں لکھا گیا۔ مگر اس میں موجودہ مواد بیکن کے موضوع سے بالکل مختلف اور جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔ بیکن کہتا ہے کہ ایجادات کے لیے معاشرے میں موجود افراد ذہنی طور پر تیار رہنا چاہیے مگر اس کے برعکس سرسید کے مضمون معاشرے اور ایجادات پر بحث کی بجائے علوم جدید کی اقسام بیان کرتا ہے۔ سرسید دورہ انگلستان کے بعد انگریزی نظام تعلیم سے انتہائی متاثر تھے۔ لہٰذا تاریخی حقائق کا ادراک کیے بغیر سرسید نے علوم جدیدہ کے عنوان سے تحریر کیے گئے مضمون میں سیاق وسباق سے ہٹ کر دلائل پیش کیے۔ سرسید چونکہ نیم خواندہ اور جدید علوم و تاریخ سے بے خبر ہندوستانیوں سے مخاطب تھے۔ لہٰذا اس مضمون میں تاریخی حقائق سے نہ صرف، صرف نظر کیا گیا بلکہ سرسید کو اپنے دلائل کی پختگی پر اتنا یقین تھا کہ انھوں نے علوم جدیدہ کی اقسام گنواتے ہوئے مسلم تاریخ سے مکمل بے خبری کا مظاہرہ کیا حالانکہ ان کی تصانیف بالخصوص دہلی کی تاریخی عمارات کے حوالے سے لکھی گئی تصنیف آثار الصنادید ہیں۔ سرسید مسلم تاریخ سے اس قدر بے خبر محسوس نہیں ہوتے جیسا کہ مضمون موضوعاتی لحاظ سے ایک سے ہیں

مگر انداز فکر الفاظ کے انتخاب اور مقصد کے الگ ہونے کی وجہ سے ان کا انداز تحریر یکسر الگ اور اچھوتا محسوس ہوتا ہے۔

سرسید کا مضمون علوم جدیدہ، جدید علوم کی اقسام پر بحث کرتا ہے۔ لہٰذا ابتدا ہی میں سرسید نے مضمون لکھنے کی وجہ بیان کر دی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

> ہماری تحریروں میں اکثر لفظ علوم جدیدہ آتا ہے غالباً اس کی مراد میں لوگوں کو شبہ رہتا ہو گا۔ اس لیے اس کی تفسیر کرنی مناسب معلوم ہوتی ہے۔[۷]

بیکن کے مضمون Of Innovations میں مصنف نے ایجادات سے متعلق انسانی نفسیات کا بہترین تجزیہ پیش کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ:

> All this is true if time stood still; which contraniuise moveth so round, tkat a forouard retention of custom is as turdadent a thing as an imovation: and they that reverence too much old times are but a seorm to the new.[۸]

دونوں مضامین کے موضوعاتی جائزے سے پتا چلتا ہے کہ ہر دو مصنفین نے اپنے اپنے طور پر مضامین میں مواد کی پیش کش کی ہے جن میں موضوع کی یکسانیت کے علاوہ کچھ بھی مشترک نہیں ہے۔

Of Negotiating بیکن کا وہ مضمون ہے جس میں مصنف نے کسی شخص، افراد یا ادارے سے بات چیت میں قانونی پہلوؤں کو مد نظر رکھنے کی اہمیت پر بحث کی ہے۔ بیکن کے بقول کسی فرد سے بالشانہ بات کرنا اور قانونی حیثیت کو مد نظر نہ رکھنا قانونی اور مالی طور پر بے حد نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے کیونکہ بیکن کے مطابق آدمی کا ذہن بدلنے یا مذکورہ بالا کو بھولتے دیر نہیں لگتی۔ لہٰذا کسی سے کاروباری معاملات کرتے وقت تمام اہم امور کو کاغذی کاروائی کے ذریعے انجام دینا دونوں طرف کے افراد کے لیے زیادہ بہتر ہو جائے گا کیونکہ بذریعہ دستاویز کوئی معاملہ کرتے وقت نہ صرف قانون کے متخلف پہلو مد نظر رکھے جاتے ہیں بلکہ معاملات کو قانونی شکل دیتے ہوئے نکات میں موجود، بہامات کو دور کرنے میں مدد ملتی ہے۔

دوسری جانب عدالت کے ذریعے بات کرتے وقت گواہی کی بڑھ جاتی ہے۔ جب دو افراد آپس میں معاملہ کرتے وقت تیسرے شخص کو اپنا وکیل بناتے ہیں تو نہ صرف وقت کی بچت ہوتی ہے بلکہ وقت پر مبنی نکات کو ٹھیک ٹھیک نمٹانے میں بھی کسی قسم کی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ قانون کے پہلو سے جب دو کاروباری حضرات آپس میں معاملہ کرتے ہیں تو اس میں چالاک اور فائدہ کی تلاش میں رہنے والا فریق غلط معاملہ کرنے سے باز رہتا ہے کیونکہ لکھت پڑھت میں ہوئے معاملے کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنا دوسرے کے لیے انتہائی مشکل ہے۔ اس مضمون میں Letter بمعنی Agreement یا معاہدے کے استعمال ہوا ہے۔

بحث و تکرار سرسید کا نہایت مشہور مضمون ہے۔ یہ موضوع کے لحاظ سے کسی حد تک بیکن کے مضمون Of Negotiating سے مشابہ ہے مگر موضوع کے علاوہ دونوں مضامین کے نفیس مضمون کے بہت زیادہ فرق ہے جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ Of Negatiating میں بیکن نے زبانی کلامی بات کرنے کی بجائے کاروباری اور خاندان کے پیچیدہ معاملات کو حل کرنے میں عدالت نے اہمیت واضح کی ہے اور اپنے تمام معاملات کو قانونی بنانے کی راہ دکھائی ہے مگر سرسید کا مضمون اس کے برخلاف ہے۔ معاشرے کے نامہذب افراد کے انداز گفتگو اور نشست و برخاست پر بحث کرتا ہے۔ سرسید کے مطابق نامہذب لوگ ادب و آداب اور حفظ و مراتب کی تعظیم کے قائل نہیں ہوئے اور زندگی کے رہ معاملے میں باہم دست و گریباں ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ معاملات اچھے طریقے سے سلجھانے کی بجائے جھگڑے کے ساتھ اپنے مقصد کو حاصل کیا جائے۔

مضمون میں سرسید نے بحث و تکرار میں مہذب لوگوں اور کتوں کے مابین اداب مجلس کی مشابہت کے بارے میں صراحت کے ساتھ وضاحت کی ہے۔ سرسید کا لہجہ نہایت کڑا اور بے لچک نظر آتا ہے مگر اس کے باوجود جملوں کی چاشنی اور دل میں موجود مروت ہر جملے سے واضح ہوتی ہے۔ ہر دور مضامین میں موضوع کے علاوہ نفس مضمون میں کسی قسم کی مشابہت کا شائبہ نہیں گزرتا۔

Of Custom and Education کے عنوان سے بیکن کے مضمون میں بیکن نے رسم و رواج کے انتہائی طاقت ور ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ تاریخ کی مثالیں دیتے ہوئے بیکن نے نہایت اچھے انداز میں واضح کیا

ہے کہ غلط رسوم ورواج کی پابندی انسانی معاشروں کے تباہ کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ وہ مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ برصغیر کا مذہبی جنونی ہو یا روس کا عقائد پر سختی سے عمل پیرا راہب دونوں ہی اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے اور موت سے ہمکنار کرنے میں دیر نہیں لگاتے۔ بیکن کے مطابق تعلیم اور شعور کے ذریعے اچھی رسومات کو معاشرے میں رواج دینے اور غلط رسومات کا قلع قمع کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ قبیح اور مکروہ رسوم ورواج کے ذریعے انسانی زندگی کو اذیت میں ڈالنے اور موت کے گھاٹ اتارنے کا مضمون رسوم ختم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ بیکن کہتا ہے کہ انسان انتہائی تعلیم یافتہ اور لبرل ہونے کے باوجود رسوم ورواج کے دائرے سے باہر نکلنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ اس لیے معاشرے کو بیک جنبش قلم غلط روایات کو رد کرتے ہوئے اچھی اور خوب صورت روایات کو جنم دینے اور انہیں پھلنے پھولنے کا موقع فراہم کرنا چاہیے تاکہ اس طرح سے مطمئن اور آسودہ حاصل معاشروں کے قیام کا خواب شرمندہ تعبیر کیا جائے۔

ب) رسوم ورواج کا فلسفہ اور اس میں اصلاح کی ضرورت:

سرسید نے اپنے مضمون رسوم ورواج کا فلسفہ اور اس میں اصلاح کی ضرورت میں رسوم ورواج کی بدترین یا نہایت اچھے دونوں طرح کے نتائج پر بحث کی ہے۔ مضمون میں سرسید نے بیکن کی طرح تقابل سے کام لیا ہے۔ ان کے مطابق جو کام ایک مذہب کے ماننے والوں کے ہاں مبارک و محترم ہے دوسرے مذہب میں حرام ہے۔ تقابل کرتے ہوئے سرسید کہتے ہیں کہ:

> ایک ہندو اپنے پیارے باپ کی لاش کو کس محبت اور عزت اور نیکی اور بدی نجات کے یقین سے نہایت خوف ناک اور تیز بھڑکتی آگ میں جلاتا ہے اور پھر اس کی جلی ہوئی مٹی سے اس کی ہڈیوں کو چنتا ہے اور ان کا نام پھول رکھا جاتا ہے اور پھر گنگا میں بہاتا ہے۔ مگر ایک یہودی یا عیسائی مسلمان اس کو نہایت بے رحمی اور سنگ دلی کا کام سمجھتا ہے۔[۹]

سرسید کے مطابق رسوم ورواج کو انسانی بھلائی اور خیر کے مطابق تبدیل کرنا اچھی بات ہے اور اسی سے معاشرہ ترقی کرتا ہے۔ بد رسومات قوم اور ملت کی رسوائی اور دیگر اقوام کے ساتھ رسوائی اور ذلت کا

باعث بنتی ہیں جبکہ اچھی رسومات سے معاشرے میں موجود خرابیوں کو دور کرنے میں مدد ملتی ہے اور انسانی معاشرے کو اچھی رسومات سے امن وآشتی اور معاشی اور معاشرتی پیش رفت کا ذریعہ بنایا جاسکتا ہے۔ مذکورہ مضمون بیکن کے مضمون Of Custom and Education کی طرز پر لکھا گیا ہے۔ اس میں بیان کی گئی باتیں بالکل وہی ہیں جس سے متعلق بیکن نے باتیں کی ہیں مگر بیکن نے مذہب کو زیادہ طاقت ور سمجھتے ہوئے اس سے متعلق بات کی ہے جبکہ سرسید نے رسوم ورواج کو مذہب کا درجہ دیتے ہوئے ان کے اصلاح پر زور دیا ہے۔ دونوں کا مقصد امن ومحبت اور یگانگت قائم رکھنا ہے۔

Of Honour and Reputation بیکن کا مضمون ہے جس میں بیکن نے انسانی معاشرے میں آدمی کی پہچان اور عزت کے بارے میں مجلًا بات کی گئی ہے۔ بیکن کے مطابق عزت اور پہچان یا شہرت جس قدر زیادہ ہوتی ہے اسی قدر یہ انسان کی ذاتی زندگی مشکل سے مشکل تر کی طرف لے کر جاتی ہے۔ یہ ایک عمومی بات ہے کہ انسان فطرتاً نیک خو واقع ہوا ہے مگر شر کا مادہ بھی انسانی سرشت کا اسی طرح سے حصہ ہے۔ جس طرح نیکی انسان میں پائی جاتی ہے دونوں انتہاؤں میں ہر وقت جنگ وشر کی کیفیت ہر وقت جاری رہتی ہے اور اسی وجہ سے نیکی اور حصول شہرت اتنا مشکل امر نہیں جتنا اس نیکی پر قائم رہتے ہوئے اس کے بچاؤ کی ترکیب سوچنا۔ حصول عزت وشہرت کے مختلف پیمانے بیکن کے اس مضمون میں بتائے گئے ہیں۔ اچھی شہرت کا براہ راست تعلق کردار سے ہے۔ یہ انسانی کی سکت اور قابلیت کو ظاہر کرتا ہے۔ بیکن کے بقول عزت اور پہچان ان پیروں کی طرح ہے جو نہایت قیمتی مگر نازک ہوتے ہیں اور ذرا سی ٹھیس پڑنے پر ٹوٹ سکتے ہیں۔

سرسید احمد خان کا مضمون ''عزت'' جو بیکن کے مضمون Of Honour and Reputation کا چربہ ہے۔ اس مضمون میں سرسید نے عزت کی اصل بنیاد کی جانب مفصلاً اشارہ کیا ہے۔ ان کے مطابق بڑے القابات اور لوگوں کے مابین شہرت عزت کی نشانی نہیں اور نہ ہی بے انتہا مال ودولت اور جاہ وحشمت عزت اور احترام کے حصول کا ذریعہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ دولت اور حکومت انسان کی ظاہری جاہ وجلال میں اضافہ ضرور کرتی ہے مگر یوں ان کو کس قدر قابل عزت سمجھتے ہیں اس کا اندازہ ان کی پشت پر کہی جانے والی باتوں سے لگایا جاسکتا ہے۔ جب کوئی شخص کسی جھوٹی بات کو سچ بنا کر دوسروں کے آگے رکھتا ہے تو اس سے اس کا

مقصد داد و دھش کا حصول ہو یا پھر کوئی اور مقصد۔ ہر دو صورتوں میں بات کھلنے پر انسان کی عزت دوسروں کی نگاہ میں ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ سر سید کے مطابق اصل عزت کا پیمانہ ہمارا ضمیر ہے۔ جب تک ہمارا دل ان افعال کے بارے میں جو ہم سے انجانے میں یا جان بوجھ کر سرزد ہوتے ہیں کہ صحیح یا غلط ہونے کی گواہی نہ دے دے ہمیں خود کو قابل عزت سمجھنے کا دعویٰ نہیں ہونا چاہیے۔ سر سید کا مضمون برصغیر کے معاشرے میں موجود بڑھتی عداوت، منافقت اور دورخی کے بارے میں ہے۔ وہ قرآن مجید کی اس آیت جس کا ترجمہ:

"اور لوگوں سے سچی اور دوٹوک بات کہو۔"

کی توضیح ہے۔ صلح جوئی، بغض وعداوت سے گریز اور نفاق سے اعتراض ایسے امور ہیں جو انسان کی عزت و توقیر میں اضافے کا باعث بنے۔ انسانی دل میں بغض وعداوت کو ایک ساتھ جگہ نہیں مل سکتی۔ جسے ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔ سر سید کے مطابق:

> دل انسان کا ایک ہے، اس میں دو چیزیں یعنی عداوت، کسی کے ساتھ کیوں نہ ہو، اور محبت سما نہیں سکتی۔[۱۰]

بیکن نے اپنے مضمون Of Wisdom for man's self میں معاشرے اور فرد کے درمیان استفادہ کی بنیاد کو واضح کیا ہے۔ ان کے مطابق ایک چیونٹی اپنے لیے انتہائی عقل مند مخلوق ہے مگر اس کی مضر کاروائیوں کی پورا باغ یا چمن خراب ہو جاتا ہے۔ اسی مثال پر اپنے مضمون کی بنیاد رکھتے ہوئے بیکن کا کہنا ہے کہ فرد کو انسانی معاشرے میں چیونٹی کی طرح صرف اپنے فائدے کے بارے میں نہیں سوچنا چاہیے بلکہ اسے ایسا طریقہ کار ہونا چاہیے جس کی بدولت انسان اور معاشرے میں ایسا ربط و تعلق پیدا ہو کہ دونوں کو فائدہ پہنچے۔ فریق مخالف کو کچل کر ذاتی اغراض و مقاصد کا حصول خود غرضی کہلاتا ہے۔ جو انسانی شخصیت کی بدترین خصوصیات میں شمار ہوتی ہے۔ ایک ایسا شخص جو صرف اپنے فائدے کی بات سوچتا ہو ایسا ہے جس طرح زمین کے گرد چاند کی گردش ہوتی ہے یا سورج کے گرد زمین سمیت دوسرے سیاروں کی گردش ہوتی ہے۔ اپنے غرض کا غلام شخص نہ صرف مغرور اور خود غرض ہوتا ہے بلکہ انسانی وصف سے عاری ایسا حیوان ہوتا ہے جو کسی کی خوشی سے خوش نہیں ہوتا۔ خود غرض شخص وقتی فوائد کا حصول تو کر سکتا ہے مگر دائمی اور دور رس نتائج جو اس کی اپنی ذات کو فائدہ دے سکتے ہوں کے حصول سے محروم ہوتا ہے۔ خود غرضی پر مبنی عیاری بیکن کے

مطابق وقتی فائدے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً ایک چوہا کسی کھانے کی محفل کو اپنی موجودگی سے افراتفری میں مبتلا کرنے کی کوشش کر سکتا ہے مگر بالآخر اسے اس مکان سے نکلنا پڑتا ہے جہاں اس کا مسکن موجود ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایک منافق مگر مچھ کی سی ہوتی ہے جو چالاکی سے پانی میں اپنا آپ چھپا کر موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔

''سمجھ'' سرسید احمد خان کا مضمون ہے جس میں سرسید نے Common Sense سے متعلق بات کی ہے۔ جس کے متعلق یہ بات عام ہے کہ Common Sense is the sense whish is not common۔ سرسید احمد خان سمجھ سے متعلق یہ بات کہتے ہیں کہ بیوقوفی اور عقل مند میں بنیادی فرق یہ ہے کہ دونوں کے دل و دماغ میں خیالات آتے ہیں مگر عقل مند یہ بات اچھی طرح سمجھتا ہے کہ کون سی بات کو کس وقت اور کس طرح سے ادا کرنا چاہیے۔ گویا زبان اور رویہ نہ صرف انسان کی فطرت کو واضح کرتے ہیں بلکہ انہیں دوسروں کی نظر میں محترم و معزز یا بے وقوف بنانے میں مکمل کردار ادا کرتے ہیں۔ فہم اور سمجھ ہر انسان کے پاس موجود ہے مگر اسے کس موقع کی مناسبت سے استعمال کرنا چاہیے۔ اس کا سلیقہ بہت کم لوگوں کے پاس ہے۔ سرسید احمد خان اس بات پر اظہار تاسف کرتے ہیں کہ ہماری قوم سمجھدار ہونے کے باوجود Common Sense کے استعمال میں مغرب کی اقوام سے پیچھے ہیں۔

Of Nobility بیکن کا مضمون ہے جس میں مصنف نے شرافت کے مختلف پہلوؤں اور پیمانوں کا جائزہ لیا ہے۔ بیکن کے مطابق شرافت دو سطحوں پر ہوتی ہے۔ یعنی نجی اور عوامی۔ ذاتی معاملات میں ''شرافت'' طاقت کے استعمال کو متوازن بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے جبکہ دوسری جانب یعنی عوامی حلقوں میں شرافت یا Good will انسان کی نیک نامی کا باعث نہیں ہوتی بلکہ لوگوں میں شہرت پیدا کرنے کا باعث بنتی ہے۔ نیک نامی اور مطلق العنان حکمرانوں کا قرب پانے کے لیے لازمی امر ہے کیونکہ ایسے میں بادشاہ کارناموں کی بجائے عوامی حلقوں میں افراد کی مقبولیت اور نیک نامی کے بارے میں زیادہ دریافت کرتے ہیں۔ بیکن کے مطابق عام افراد خاندانی امیروں اور نوابوں کے لیے حسد کے جذبات محسوس نہیں کرتے اس لیے نامور اور مشہور خاندانوں میں سے افراد کو بڑے عہدوں پر فائز کرنے سے ملک میں طاقت کا توازن درست

کرنے اور قیام امن میں مدد ملتی ہے۔ مذکورہ مضمون نیک نامی اور شرافت کے دو سطحوں کا جائزہ مختصر مگر جامع انداز میں پیش کرتا ہے۔

سرسید کا مضمون ''ہمارے رؤسا اور قومی بھلائی'' بیکن کے مضمون ''Of Nobility'' کے چربے کی ایک ناکام کوشش ہے۔ اول الذکر مضمون میں سرسید نے دولت مندوں کی دولت میں اضافے، ذراعت کے جدید طریقوں کو اپنانے اور ایجادات سے فائدہ اٹھانے کے بارے میں مضمون یہ بتاتا ہے کہ بڑے زمیندار کس طرح اپنی زمین کی پیداوار اور قیمت میں اضافہ کرسکتے ہیں جب کہ بیکن کا مضمون اس کے برعکس نیک نامی کو بادشاہت کے قرب کا ذریعہ بنانے کے بارے میں ہے۔ البتہ دونوں مضامین میں اہل ثروت کے قومی بھلائی کے کاموں کے بارے میں ان کے کردار کی وضاحت کی گئی ہے۔ سرسید کا مضمون ہندوستان کے لوگوں کے معاشی حالات کو بہتر بنانے ان کی معاشرت کو بہتر کرنے اور ان کی طرز رہائش بہتر بنانے سے متعلق ہے۔ سرسید نے اس مضمون میں بیکن کی طرح خیالات کو ترتیب دینے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا جس کی وجہ سے مضمون میں ربط اور خیالات میں ضبط کی کمی ہے۔

بیکن کا مضمون Of Unity in Religion انسانی طبقوں مذہب اور غیر مذہب طبقوں کے خیالات کے درمیان ہم آہنگی اور اتحاد کی بنیاد پر بحث کرتا ہے۔ یورپ میں سائنس کے دخول نے وہاں کے مذہبی طبقوں کے لیے شدید ترین خطرات پیدا کر دیئے ہیں۔ یہ سولہویں صدی تھی جب کیتھولک چرچ نے اپنے خلاف بڑھتے خطرات کا اندازہ کر لیا تھا۔ سترھویں صدی میں صنعتی انقلاب نے یورپ کے معاشرے کو اپنی جکڑ میں لے چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی مذہب پر لوگوں کو قائل کرنے کی پادریوں کی صلاحیت انتہائی کمزور ہو چکی تھی جس کے سبب چرچ دو حصوں میں منقسم ہو گیا۔ یعنی یکھتولک اور پروٹیسٹنٹ۔ پروٹیسٹنٹ مسلک بعد ازاں مزید کئی حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ یہ مضمون لکھتے وقت بیکن کی نظر میں یورپ کی مذہبی تاریخ کا حوالہ پوری وضاحت کے ساتھ موجود تھا۔ اس لیے ہر دو طبقات کے مابین اتحاد کی بنیاد پر بحث کرتے ہوئے بیکن کا نظریہ بے لاگ اور شک وشبہات سے بالاتر ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اتحاد کی بات کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ ہم مذہب اور معاشرت میں یکساں پہلوؤں کو دیکھیں اور نزاعی پہلوؤں سے صرف نظر کریں۔ نزاعی پہلوؤں

سے متعلق بات کرتے ہوئے بیکن کا کہنا ہے کہ جس بنیاد پر ہر دو طبقات کے درمیان اختلاف موجود ہے۔ وہ ان میں سے اکثر سطحی اور معمولی ہیں۔ مثلاً بہت زیادہ اختلاف انتہائی معمولی باتوں پر ہے۔ پہلی بات جس پر مذہبی افراد زیادہ زور دیتے ہیں ان رسوم ورواج کی پابندی ہے۔ جس کا مذہب کو ایک ایسا ہوا بنا دیا ہے جس کی پابندی ناممکن حد تک مشکل نظر آتی ہے۔ لوگوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے بیکن یہ صلاح دیتا ہے کہ حکومت اور چرچ دونوں کو مذہب کو صحیح معنوں میں واضح کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس کے مبہم حصوں کو نئے سرے سے آباد کر کے لوگوں کے سامنے آنا چاہیے۔ کیونکہ اس طرح کی تفریق قوم وملت کے موافق نہیں ہے۔ افہام وتفہیم اور برداشت لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں ممد ومعاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

ج) مذہب اور معاشرت:

سرسید کا مضمون مذہب اور معاشرت در حقیقت مذہب اور دنیاوی معاملات کو الگ الگ رکھنے سے متعلق ہیں۔ سرسید کے مطابق اسلام کے اصولوں پر مبنی زندگی گزارنا مشکل نہیں مگر مذہب میں کچھ ایسی چیزیں شامل ہو چکی ہیں جو مذہب میں شامل نہیں ہیں۔ مگر معاشرے کے لوگوں نے اسے زبردستی مذہب سے جوڑ رکھا ہے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے سرسید یہ کہتے ہیں کہ تورات میں موجود اصل تعلیمات ختم ہو چکی ہیں۔ اس کے نام سے دستیاب کتابوں میں تورات کی اصل تعلیمات نہیں ہیں۔ تاریخی مثالوں سے حوالہ دیتے ہوئے سرسید کے مطابق یہودی اصل تعلیمات کی بجائے روایات یا غلط طور پر منسوب باتوں کی پیروی کر رہے ہیں۔ بعینہ مسلمان حدیثوں کی غلط توجیہات پیش کر کے سادہ لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں۔ مثال دیتے ہوئے سرسید کہتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص ٹخنوں سے دو انچ اوپر شلوار رکھنے پر جنت میں جائے گا جبکہ دو انچ نیچے رکھنے پر دوزخ کا مستحق ٹھہرے گا۔ سرسید کے مطابق بعض حضرات ازار اوپر رکھنے پر ٹخنوں سے نیچے رکھنے والوں سے زیادہ مغرور اور متکبر نظر آتے ہیں۔ ان کے مطابق اس حدیث کا اصل مقصد عجز وانکساری اختیار کرنے سے متعلق ہے۔ جب کہ مولوی حضرات صرف سرسری نظروں سے دیکھ کر حدیث کے مفہوم کی وضاحت کرتے ہیں۔ سرسید کے مطابق دنیاوی معاملات مذہبی معاملات سے الگ ہیں۔ قرآن

میں اس کا ذکر اس بات کی دلیل نہیں یہ بھی مذہب میں داخل ہے۔ سرسید نے اس مضمون میں مذہب ومعاشرت کی ذمہ داریوں اور امور سے متعلق بات کرتے ہوئے کچھ ایسی باتیں کی ہیں جن کو بڑی حد تک نزاعی کہا جاسکتا ہے۔

د) مضامین کا اسلوبیاتی تقابل:

سرسید احمد خان کے مضمون مذہب ومعاشرت میں سرسید نے طویل مگر سادہ الفاظ سے ایک نہایت اہم مسئلے پر بحث کی ہے۔ سرسید نے اس مضمون میں لگی لپٹی رکھے بغیر سیدھے سیدھے الفاظ میں بات کی ہے اور بات کرتے وقت دلائل کو پیش نظر رکھا ہے۔ سرسید جذبات کی رو میں بہنے کی بجائے عقل پر مبنی رائے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ حتی کہ مذہب جیسے حساس معاملے میں بھی عقل کے استعمال کو برا نہیں سمجھتے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اپنے وقت میں سرسید کو مذہبی طبقے کی جانب سے شدید لعنت وملامت کا نشانہ بنایا گیا۔ سرسید نے اس مضمون میں یہودیوں کی مذہبی تعلیمات کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور ان بے سروپا رسومات کو مسلمانوں کے ان رسومات سے جوڑنے اور موازنہ کرنے کی کوشش کی ہے جو ان کی نظر میں بنیادی کی بجائے ثانوی اہمیت کے حامل ہیں۔ مضمون کے بیان میں سرسید نے نہایت سادہ انداز میں اپنے دل کی بات قارئین تک پہنچانے کی کوشش کی۔ جس سے ایک بڑا حلقہ ان کے زیر اثر آگیا۔ اردو کا مروجہ اصول سیدھی اور صاف بات کرنے میں منع تھا مگر سرسید نے اس اصول سے انحراف کرتے ہوئے ایک نئے مگر موثر انداز کو اختیار کیا اور بعد میں یہی انداز اردو کے نثری ادب میں ترویج اور ترقی کا سبب بنا۔ مضمون میں سرسید نے اپنے بیان کو تقویت دینے کے لیے نہ صرف دلائل اور براہین سے کام لیا بلکہ اس بات کی کوشش کی کہ اپنی بات کے موثر اظہار کے لیے انھوں نے سادہ سے سادہ اور روز مرہ الفاظ کو ادب کا درجہ دینے سے گریز نہیں کیا۔ اس مضمون میں یہ بات بیان کرتے ہوئے ان کی اپنی ذات نہایت نمایاں نظر آتی ہے۔ کسی بھی طرح اس بات کا پتا نہیں چلتا کہ انھوں نے اس بات کو تیسرے فریق کی جانب منتقل کرنے کی کوشش کی ہو یا اپنی رائے کو اکثریت کی رائے قرار دینے کی کوشش کی ہو بلکہ ان کا انداز بیان ان کی ذات کے گرد اس طرح سے گزدش کرتا ہے کہ یوں لگتا ہے کہ وہ موجود کے خلاف لڑنے کا تہیہ کیے بیٹھے ہیں۔

سرسید کے مضمون کے مقابلے میں بیکن کا مضمون Of Unity in Religion اسلوب کے لحاظ سے سرسید کے مضمون سے کسی قدر مشابہ ہے۔ تاہم بہت ساری دیگر خصوصیات میں بیکن کا مضمون سرسید کے مضمون سے مختلف بھی ہے۔ سرسید کی مانند بیکن بھی اس بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ انسانوں کو آپس میں جوڑے رکھنے میں مذہب کا کردار سب سے اہم ہے۔ یہ خوشیاں بانٹنے اور مشمول اور مطمئن معاشرے کے قیام میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ سرسید اور بیکن کا مضمون نہ صرف نفس مضمون کے لحاظ سے مختلف ہے بلکہ اس میں اسلوب کے حوالے سے بھی تفرقات موجود ہیں۔ بیکن کا اسلوب یہ ہے کہ اس کے مضمون کے پہلے ایک یا دو جملے بعد میں آنے والے موضوع کی پوری طرح عکاسی کر دیتے ہیں۔ بیکن غیر ادبی، مستقل اور متروک الفاظ کے استعمال کا سخت مخالف ہے مگر دوسری جانب الفاظ اور محاورات کے آسان استعمال کو بھی اچھا نہیں سمجھتا۔ اس کے الفاظ میں اگر اں باری کے ساتھ ساتھ نفسیاتی اور فلسفیانہ تکنیک کا استعمال بھی اہمیت رکھتا ہے۔

اس مضمون میں پہلی لائنوں میں مضمون کا تعارف کرانے کے بعد اس کے مباحث کو الگ الگ انداز سے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ڈرامائی انداز بیکن کے مضامین کی پہچان ہے۔ جس سے نہ صرف پڑھنے کے جذبے میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ رفتہ رفتہ کھلنے والے رموز مطالعے کا مزہ دوبالا کر دیتے ہیں۔

اشتراکات:

اس مضمون میں بیکن اور سرسید کے مضامین میں کافی اشتراکات نظر آتے ہیں۔ اول یہ کہ سرسید نے مذہب اور معاشرے کے حوالے سے اظہار خیال کیا جبکہ بیکن نے بالکل اسی طرح مذہب باصورت آلہ اتحاد کی بنیادوں پر بحث کی ہے۔ یہ اتحاد معاشرے میں مختلف فکری نظریات کو ماننے والے افراد کے مابین اتحاد قائم کرنے کے موضوع پر ہے۔

دوم یہ کہ سرسید نے بیکن کی مانند اپنی بات کرنے اور اس کے لیے دلیل لانے سے متعلق بات کی ہے۔ جبکہ اس کی مانند بیکن نے بعینہ بغیر دلیل کے لاف گذاف کرنے سے گریز کیا ہے۔ سرسید مذہبی معاملات میں مداخلت سے مکمل گریز کا مشورہ دیتے ہیں اور بیکن عملی طور پر اس سے متعلق بات نہ کرتے ہوئے اپنی

مذہب سے متعلق پالیسی کو منظر عام پر لانے سے گریز کرتے ہیں۔ سر سید اور بیکن دونوں کے مضامین پڑھتے وقت ذہن میں ابھرتے سوالات کے جوابات جان کر دلی خوشی ہوتی ہے۔

افتراکات:

سر سید اور بیکن کے مضامین کئی لحاظ سے ایک دوسرے سے متفرق ہیں۔ اول یہ کہ سر سید بیکن کی مانند نظروں اور دماغ کو کشش کرنے والے جملوں کی بندش سے قاصر نظر آتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ابتدا میں ان کے مضمون میں دلچسپی پیدا ہونے کا عنصر بیکن کی بہ نسبت کم ہے۔

دوم یہ کہ بیکن نے جس وقت مضامین لکھنے شروع کیے وہ ملازمت سے برخاست ہونے کے بعد ان کے آرام اور تنہائی میں بیٹھ کر اپنی گزشتہ زندگی اور فیصلوں پر غور کرنے کے دن تھے۔ جبکہ اس کے برعکس سر سید مسلمانوں کی ڈوبتی ناؤ کو بچانے کے لیے سر توڑ کوششوں میں مصروف تھے۔ اس وجہ سے سر سید کی اپنی رائے پر عمل کرنے زور بیکن کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ سر سید سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں ان پر عمل کرنا اور انہیں مشکل راہ بنانا مسلمانوں کی دنیاوی واخروی کامیابی کے لیے زیادہ مفید اور موثر ہے۔ جبکہ بیکن کے پیش نظر کوئی مقصد نہ تھا۔ اس کو اپنی لیاقت کے اظہار اور فلسفیانہ انداز کو لوگوں میں متعارف کرانے کا شوق تھا۔ اس لیے اس نے مضمون کو حادثاتی طور پر اختیار کر کے انگریزی ادب میں مضمون جیسی گری پڑی صنف کو بلندیوں تک پہنچا دیا۔ سر سید بات کرتے ہوئے جذباتی وہ جاتے ہیں جبکہ بیکن کے نزدیک جذباتیت انسان کی غیر جانبداری کو شدید طور پر متاثر کرتی ہے۔ لہٰذا تجزیہ کرتے وقت غیر جانبداری کو ایک طرف رکھنا مضمون نگار کے لیے نہایت ضروری ہے۔ سر سید کے مضمون میں ان کی اپنی شخصیت کی جھلک نہایت نمایاں ہے۔ جبکہ بیکن نے شخصیت کو ایک جانب رکھ کر اپنے ہی افکار کو کسی تیسرے شخص سے منسوب کرنے کی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ مگر دونوں مضامین میں مذہب اور معاشرت پر بحث کی گئی ہے۔ دونوں ہی نہایت قابل ادیبوں کے لکھے ہوئے ہیں مگر سر سید کے مضمون میں عجلت پسندی زیادہ ہے۔ اس کے برعکس بیکن کا مضمون عجلت پسندی کی بجائے اختصار کم سے کم الفاظ میں اپنی بات کو دوسروں تک پہنچانا اور دنیا کے دیگر خزینہ ہائے ادب کی مثالوں کو پیش کرنا بیکن کی نمایاں خصوصیت ہے۔

سرسید احمد خان کا مضمون عزت مذہب ومعاشرت کے مقابلے میں مختصر مگر جامع ہے۔ اس کی خصوصیات بالکل گزشتہ مضامین کی طرح ہیں۔ عزت کے موضوع پر بات کرتے ہوئے سرسید کا نقطہ نظر واضح ہے۔ وہ عزت کی بنیادوں کو تلاشتے ہیں اور یہ بھی کہ عزت کس طرح سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ جھوٹ، مکاری اور وعدہ خلافی جو ہمارے معاشرے کا لازمی جزو بن چکی ہیں کا رد کرنا ہی عزت کے حصول کا راستہ ہے۔ گزشتہ مضمون کی طرح اس مضمون کی تمہید گنجلک اور معنی ومفہوم سے عاری نظر آتی ہے اور ابتدائی جملوں میں عجز موضوع کے یہ پتا نہیں چل سکتا کہ مصنف نے کس موضوع پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس مضمون میں سرسید کے انداز میں جلد بازی نظر آتی ہے اور دلائل کا ایسا مجموعہ نظر نہیں آتا جس سے سرسید اپنی بات کی سچائی کو ثابت کر سکیں۔ البتہ اختصار کی وجہ سے یہ مضمون گزشتہ مضمون پر اس لحاظ سے فوقیت رکھتا ہے کہ سرسید نے کم سے کم الفاظ میں اپنے مطمع نظر کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ دو چیزیں جس کی مدد سے باہمی تقابل کیا جانا لازمی ہے وہ اس میں نظر آتی ہیں یعنی دوستی اور دشمنی۔ سرسید نے مختصر الفاظ میں دوستی اور دشمنی ہر دو امور میں انسان کو عزت حاصل کرنے کا طریقہ بتلایا ہے۔ سرسید کے اس مضمون میں جملے مختصر، بامعنی اور سلیس ہیں۔ جن کو سمجھنے کے لیے کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔ یہ زبان اخبار اور رسائل کے لیے بہت اچھی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسے تہذیب الاخلاق گرامی القدر رسالے میں جگہ ملی ہے۔ اختصار، ایجاز اور دو ٹوک بات اس مضمون کو اہم اسلوبیاتی خصوصیات میں سے چند ہیں۔

Of honour and Reputation بیکن کا مضمون ہے۔ جس میں بیکن نے نہایت سلیس انداز میں عزت اور شہرت عام یا بدنام شہرت پر بات کی ہے۔ ان کے مطابق شہرت انسان کی قابلیت اور نیک خو ہونے کی دلیل ہے کیونکہ لوگوں کے مابین اچھی شہرت حاصل کرنا بڑی حد تک مشکل ہے۔ یہ ایک سنہری موقع ہوتا ہے جب ایک انسان اپنی اچھی شہرت کا فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ اس مضمون کی زبان سلیس اور عام فہم ہے۔ بیکن دیگر تمام مضامین کی نسبت اس مضمون میں فلسفیانہ انداز کی بجائے عام فہم انداز اختیار کیا ہے۔ تاہم بقیہ دیگر مضامین کی طرح اس کا انداز بھی مدلل اور حکمت بھرا ہے۔ الفاظ کی نشست وبرخاست انتہائی جامع اور خوبصورت ہے۔ کہیں بھی زائد الفاظ یا جملے کا گمان نہیں گزرتا۔ اس مضمون میں عزت کمانے اور اپنی شہرت

عام سے بادشاہوں کا قرب حاصل کرنے کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔ انتہائی مشکل امور بیکن کے قلم سے انتہائی سلیس انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ فلسفیانہ انداز کے باوجود اس مضمون کے جملے گراں بار نہیں گزرتے۔ بقیہ مضامین کی طرح پہلے مصرعے کی وضاحت بعد میں اس کے مختلف پہلو اور آخر میں جاندار تجزیہ مضمون کی وقعت میں اضافہ کرتا ہے۔ مزید برآں کہ بیکن اپنی کسی بات پر زور دینے کی بجائے مختلف پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اس میں سے سب سے بہتر پہلو نکالنے کا ہنر جانتا ہے۔ جس سے قاری میں نہایت اچھے اثرات پڑتے ہیں۔

اشتراکات:

سرسید کا مضمون بیکن کے مضمون کی مانند مختصر اور جامعیت لیے ہوئے ہے۔ سرسید کے مضمون میں فرد کی ذاتی زندگی کو زیر بحث لایا گیا ہے اور یہی صورت حال بیکن کے مضمون میں بھی نظر آتی ہے۔ دونوں ہی عزت کے حصول اور اس کی مدد سے رتبہ اور دولت کے حصول کی راہ دکھاتے ہیں۔ دونوں کا مطمع نظر روحانی مادی ہے۔

افتراکات:

سرسید کا مضمون ''عزت'' چند وجوہات کی بنا پر مواد اور فکر کے لحاظ سے بیکن کے مضمون Of Honour and Reputation سے مختلف ہے۔ اگرچہ دونوں مضامین میں فرد کی ذاتی زندگی کو بیان کیا گیا ہے۔ مگر بیکن کا مضمون وسعت نظری کے لحاظ سے سرسید کے مضمون پر فوقیت رکھتا ہے۔

سرسید نے صرف عام آدمی کو مشورے دینے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ اس کے برعکس بیکن کی رسائی برطانوی بادشاہ کے دربار تک تھی۔ اس لیے اس کے مضمون میں مشورے بادشاہ کے لیے بھی موجود ہیں۔ بیکن تفویض اور اضافے کا قائل تھا لہٰذا اس کے جوڑوں میں اضافی الفاظ یا ناپسندیدہ اصطلاحوں کا استعمال مفقود ہے۔

سرسید بیکن کے برعکس ایک کثیر الجہت کوشش کرنے والے شخص تھے۔ لہٰذا وقت کی کمی کے باعث ان کے جملوں میں دروبست تقطیع کے لیے وہ وقت میسر نہیں تھا جو بیکن کو حاصل تھا۔ لہٰذا جلد بازی کے علاوہ بسا اوقات معلومات کی کمی ان کے مضامین سے ظاہر ہوتی ہے۔ بیکن کے مضمون لکھنے سے قبل تحقیق کے بغیر کسی واقعے کو یا حوالے کو درج کرنے کا قائل نہیں مگر سرسید نے بعض اوقات سنی سنائی باتوں کو بھی مضامین میں درج کیا ہے۔ اس مضمون میں یہی صورت حال نظر آتی ہے۔

سرسید نے اپنے مضمون تعصب میں مذہبی، نسلی، لسانی اور علاقائی تعصب کے بارے میں بات کی ہے۔ ان کے مطابق تعصب انسان کی تمام خوبیاں ختم کر کے برائیوں کو نمایاں کر دیتا ہے۔ سرسید نے اس مضمون میں نہایت سلیس انداز میں تعصب اور اس کے مختلف پہلو پر اظہار خیال کیا ہے۔ اس مضمون میں سرسید نے مولانا حالی کے اشعار بھی پیش کیے ہیں۔ حالی چونکہ علی گڑھ تحریک سے وابطہ ادبی شخصیت تھے۔ لہٰذا خیالات کی یکسانیت نے انہیں سرسید کے قریب کر دیا۔ اسی سبب حالی کے اشعار کثرت سے مضمون میں شامل کیے ہیں اور یہ کثرت اتنی زیادہ ہے کہ مضمون بے وقعت ہو کر رہ گیا ہے۔ اس مضمون میں سرسید نے نیم خواندہ اور کٹر مذہبی ملاؤں کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ یہ سبب ظاہر کیا ہے۔ کہ ان نیم خواندہ ملاؤں نے برصغیر کے مسلمانوں کی ذہنیت بدل کر انہیں ایک دوسرے کے مدمقابل لا کھڑا کیا ہے۔ مضمون گزشتہ مضامین کی مانند سلیس ہے مگر جوش خطابت کی وجہ سے سرسید موضوع سے ہٹے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں کو اپنی تاریخ سے سبق حاصل کرنے کی اس مضمون میں نمایاں طور پر بات کی گئی ہے۔ سرسید اس مضمون میں شخصی سے زیادہ مجموعی رجحان کا زیادہ ذکر کرتے ہیں۔

بیکن کا مضمون Of Superstition تعصب کی بجائے توہم پرستی اور غلط عقائد رکھنے کے بارے میں ہے۔ بیکن خدا پر یقین نہ رکھنے والے کے مقابلے میں خدا پر غلط تصورات رکھنے والے کو زیادہ برا سمجھتا ہے۔ مضمون کا پہلا جملہ بیکن کے روایتی فلسفیانہ انداز کا غماز ہے جس میں ایک ہی جملے میں خدا کے بارے میں غلط تصور رکھنے کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ غلط عقائد رکھنے والے انسان بیکن کے نزدیک سب سے زیادہ برے لوگ ہیں کیونکہ یہ انسانی شخصیت کو بدترین سطح پر لے جانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ بیکن یہ بات

کہتا ہے کہ توہم پرستی انسان کے علم وہنر کو گرا دیتی ہے۔ حسب توقع بیکن نے اس میں اخلاقی تعلیم دینے کی بجائے اپنانقطہ نظر واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ توہم پرستی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> The causes of superstition are, pleasing and sensual notes and ceremories; excess of outward and pharisaical holiness; over-great reverence of traditions, which cannot but load the church; the stratagems of prelates for their own ambition and luere; the feveuring too much of good intentions, which openth the gate to conceits and novelties; the laking on aim at divine matters by human, which cannot but breed mixture of imaginations; and lastly barbarous times, especially joined with calamities and disasters."

مندرجہ بالا حوالے سے بیکن کی زبان وبیان اور اسلوب کے بارے میں بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ توہم پرستی کی وجوہات بیان کرتے ہوئے بیکن کا انداز منطقی، غیر مبہم اور جامع ہے جو دیگر مضامین میں بھی نظر آتا ہے۔ بیکن کی حاشیہ آرائی اور الفاظ کی زیبائش اتنی خوبصورت اور دلنشیں ہے کہ کہیں سے بھی غیر فطری اور مرقع معلوم نہیں ہوتی بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بیکن نے فطرت سے ہم آہنگ ہو کر خیال آرائی کی ہے۔

اشتراکات:

سرسید کا مضمون تعصب بیکن کے مضمون Of Superstition سے بالکل الگ ہے۔ بیکن مذہبی لحاظ سے توہم پرستی پر مبنی عقائد رکھنے والوں کے سخت خلاف ہے مگر سرسید کا مضمون تعصب اس کے برعکس تعصب یعنی مخالفانہ جذبات واحساسات رکھنے کے بارے میں ہے۔ یہ مخالفانہ جذبات واحساسات جس کو تعصب کے نام سے موسم کیا گیا ہے سرسید نے اسے انسان کی کوتاہ نظری اور ناعاقبت اندیشی سے تعبیر کیا ہے۔

کیونکہ متعصب شخص اور اپنوں کے علاوہ کسی اور کا وجود بمشکل برداشت کرتا ہے اور سب کے ساتھ رواداری کے خلاف ہوتا ہے۔

بیکن کا مضمون اسی طرح تواہم پرستی کے بارے میں ہے جو انسانی خوبیوں کو ختم کر کے اس کو بدیوں کا مجموعہ بنادیتی ہے۔ دونوں مضامین کا نفس مضمون ایک دوسرے سے الگ مگر نصب العین مشترک ہے۔

سرسید نے بیکن کے مضمون سے متاثر ہو کر یہ مضمون تحریر کیا ہے۔ مگر اس دوران سمجھ نہ آنے کے سبب سرسید نے کئی فاش غلطیاں کی ہیں۔

افتراکات:

سرسید اور بیکن کے مضامین نفس مضمون کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ہر چند دونوں معاشرتی برائیوں پر تحریر کیے گئے ہیں۔ مگر دونوں میں خرابیاں جدا جدا ہیں۔ تعصب کو صرف انہی معنوں میں تواہم پرستی سے جوڑا جاسکتا ہے کہ ایک متعصب شخص اکثر و بیشتر تواہم پرست بھی ثابت ہوتا ہے ورنہ دونوں خرابیاں ایک دوسرے سے جدا ہیں۔

سرسید نے جابجا قرآن وحدیث کی تعلیمات کے مطابق مثالوں سے اپنا نقطہ نظر واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں بیکن نے فلسفیانہ انداز اختیار کرتے ہوئے زندگی کے عمومی رویوں میں موازنہ کرتے ہوئے دلائل پیش کیے ہیں۔ بیکن کا مضمون حسب توقع نہایت نفیس اور جامع الفاظ سے تحریر کیا گیا ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں سرسید کا مضمون گنجلک اور غیر واضح الفاظ و محاورات پر مرقع ہے۔ گو سرسید کے الفاظ نہایت سیدھے اور بے باک ہیں مگر ان میں جذبات اور مذہبی دلیل پیش کرنے کا جوش دکھائی نہیں دیتا بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ سرسید بامر مجبوری تاریخ اسلام یا تاریخ انبیاء سے مثال پیش کرتے ہیں۔

سرسید نے اپنے مضمون مخالفت میں دشمنی، عداوت اور حسد ورنجش کی بنیادوں پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ حسد ایک ایسا جذبہ ہے جو ان تمام برائیوں کو پیدا کرنے کا سبب ہے۔ ایک انسان دوسرے سے بغیر کسی

سبب حسد نہیں کرتا اس کے لیے اسے نہایت ٹھوس جواز کی ضرورت ہوتی ہے جو مال و دولت، حسن یا کوئی اور خوبی ہو سکتی ہے۔ وہ خوبیاں اور اوصاف جو اپنے اندر دیکھنا چاہتا ہے جب کسی اور میں پاتا ہے تو اس سے حسد کرنے لگتا ہے۔ دشمنی اور عداوت پر بات کرتے ہوئے سرسید نے کئی جملوں کے بعد اس بات کی وضاحت کی ہے کہ کون سا ایسا جذبہ ہے جو یہ سب خرابیاں پیدا کرنے کا باعث ہوتا ہے۔ سرسید نے منطق پر مبنی بات کرتے ہوئے جذبہ حسد کو مثبت جذبے میں بدلنے کے لیے اپنی تمام تر تجاویز دی ہیں۔ اس مضمون میں ایک مذہبی پیشوا کی طرح آخر میں دعا کی گئی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ مضمون نہیں بلکہ ایک مختصر تقریر ہے جو بغیر کسی ترتیب کے جذبے حسد کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرتے ہوئے آخری نتیجے پر منتج ہوتی ہے۔ سرسید کا اسلوب اس مضمون میں خطابیہ اور ندائیہ نظر آتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جملے اور سلیس زبان جس میں منطق بھی شامل ہو۔ سرسید کے اسلوب کو خوبصورت بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ وہ کسی کی ذات پر انگلی اٹھانے کی بجائے مجموعی صورت حال کو بیان کرتے ہیں۔

سرسید کے مضمون کی مانند بیکن کا مضمون Of Envy رشک و حسد کے جذبات کی مبادیات سے بحث کرتا ہے۔ اس مضمون میں بیکن نے انتہائی مرقع مگر بہترین ابلاغ پر مبنی زبان استعمال کرتے ہوئے رشک و حسد کے جذبات کے بارے میں بتایا ہے۔ اس کے نزدیک یہ دونوں جذبے بے حد طاقتور ہیں اور ہمہ وقت انسانی ذہن کو متحرک رکھتے ہیں۔ بے جا اور بے قابو خواہشات پیدا کرتے ہیں۔ سرسید کی مانند بیکن کا بیان جذبہ حسد کی مبادیات اور مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس میں بیکن نے ان افراد کی نشاندہی کی ہے جن سے عمومی طور پر لوگ سخت حسد کرتے ہیں یا حسد نہیں کرتے۔ بیکن کا انداز اس مضمون میں فلسفیانہ نہیں بلکہ نفسیاتی نظر آتا ہے۔ یوں دکھائی دیتا ہے کہ جیسے وہ عام انسان کے ذہن سے سوچتے ہوئے یہ سب باتیں تحریر کر رہے ہیں۔

اشتراکات:

دونوں مصنفین کے مضامین موضوع اور نفیس مضمون کے لحاظ سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ سرسید نے بھی عام لوگوں کے رویوں پر بحث کی ہے۔ جبکہ بیکن بھی اسی انداز میں اس مضمون پر بحث کرتا

دکھائی دیتا ہے۔ سرسید اور بیکن دونوں نے اپنے اپنے طور پر دلائل دیئے ہیں۔ سرسید کا انداز عالمانہ اور بیکن کا انداز ایک نفسیات دان کا سا ہے۔

افتراکات:

سرسید اور بیکن کے مضامین ہر چند نفسِ مضمون اور موضوع کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں مگر سرسید کا عالمانہ اور خطیبانہ انداز اپنی بات پر اصرار کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں بیکن خالصتاً انسانی بنیادوں پر بات کرتا ہے۔

ایک بے حد زیرک نفسیات دان کی مانند وہ حسد اور رشک کے جذبات کے انتہائی پیچیدہ پہلوؤں سے بخوبی واقف ہے۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ سرسید کا انداز خطیبانہ جس کی وجہ سے سرسید انسانی ذہن کی ان باریک باتوں کی طرف نہیں جاتا جس کی طرف بیکن نے اپنے مضمون میں مراجعت سے اشارہ کیا ہے۔

سرسید نے بیکن کی طرح درجہ بدرجہ لوگوں کی ان اقسام کو نہیں گنوایا جن سے لوگ حسد کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔

بیکن نے حسد کی نوعیت پر بحث کی ہے جبکہ سرسید نے قرآنی حوالوں سے اس جذبے کو بیان کیا ہے۔

مضمون Of Custom and Education انسانی رسوم ورواج کے قائم ہونے، پروان چڑھنے اور انسانی زندگی پر اس کے اثرات سے متعلق ہے۔

بیکن کہتا ہے کہ انسان خواہ کتنا ہی تعلیم یافتہ، ہنر مند، باوسیلہ اور طاقتور ہو، حقیقتاً معاشرے کے مروج اصولوں کا غلام ہوتا ہے اور رسوم ورواج سے بغاوت اس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ رسوم کی گرفت انسان پر بہت زیادہ ہوتی ہے۔ بیکن کا یہ مضمون اصلاح معاشرہ پر اس کی گہری فکر کا غماز ہے۔ اس مضمون میں جس روایت طویل جملوں اور خوبصورت دلکش عبارات سے ماحول تخلیق کرنے کی کامیاب کوشش نظر آتی ہے۔ مضمون جامعیت لیے ہوئے ہے۔ ہندو نصائح سے بہت زیادہ کام لینے کی بجائے مصنف نے رسوم ورواج کی طاقت واہمیت پر زیادہ زور صرف کیا ہے۔ اس مضمون کی ایک خوبی مثالوں کے خوبصورت اندراج میں پوشیدہ

ہے۔ کوئی جملہ مرکزی موضوع سے ہٹا ہوا محسوس نہیں ہوتا اور نہ ہی کہیں گری ہوئی بات نظر آتی ہے۔ مضمون میں منطق کے ساتھ ساتھ الفاظ وخیالات کی روانی پر خصوصی زور دیا گیا ہے۔ انشائی سنجیدگی کے باوجود بیکن کا پر خلوص انداز قاری کے ذہن پر اچھے اثرات مرتب کرتا ہے۔ مضمون نگار کے پاس اپنے حق میں بات کرنے کے لیے بے شمار مثالیں موجود ہیں مگر اس کے مکرر بیان سے مضمون کا لطف خراب ہونے کا اندیشہ ہے۔ لہٰذا صرف چند مثالیں دے کر وہ قاری کو اس بات سے اطمینان دلاتا ہے۔

> Many examples may be put of the force of the custom both upon mind and body.[۱۲]

مضمون نگار ک نگارش ا انداز یہ ہے کہ ان کے خیالات سے اتفاق نہ کرنے والا شخص بھی ان کے پر خلوص اور مبنی پر حقیقت بات سے ایک لمحے کے لیے چونک جاتا ہے۔

بیکن ایک دم ہی مختلف دلائل کا امتیاز نہیں کرتا بلکہ رفتہ رفتہ عام زندگی کے واقعات وحالات سے مثالیں پیش کر کے قاری کو قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

رسم ورواج کا فلسفہ اور اس میں اصلاح کی ضرورت سر سید احمد خان کا وہ مضمون ہے جو سر سید نے بیکن کے اتباع میں تحریر کیا۔ اس مضمون کے بہت سارے پہلو ایک دوسرے سے مماثلت رکھتے ہیں۔ سر سید نے اس مضمون میں بہت مفصل انداز میں رسم اور رواج کی تعریف بیان کی ہے۔ رسم اور رواج کی یہ تعریف ان کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے یا یوں کہیے کہ انھوں نے اپنے علم اور تجربے کی بنیاد پر ان دونوں کی تعریف اور حدود مقرر کرنے کی کوشش کی ہے۔ علاوہ ازیں اس مضمون میں رسم ورواج کی مترادف کے طور پر استعمال ہونے والے لفظ Custom کی بھی تعریف موجود ہے۔ سر سید نے تاریخی مثالوں کے ذریعے غلط رسوم کی پیروی کرنے سے باز رہنے کی ہدایت کی ہے۔ اس مضمون میں بسا اوقات مغربی مصنفین کے حوالے بھی دیئے گئے ہیں۔

اشتراکات:

سرسید کا مضمون موضوع اور مواد کے لحاظ سے بیکن کے مضمون Of Custom and education سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ مضمون طوالت کے اعتبار سے سرسید کے انتہائی مفصل مضامین میں سے ایک ہے۔ اس میں سرسید بیکن کی مانند تاریخی حوالوں کو پیش کرتے ہیں۔ جن مثالوں کو بیکن نے انتہائی اہم جانتے ہوئے پیش کیا ہے۔ سرسید نے انتہائی مفصل انداز میں پیش کیا ہے۔ مثلاً بیکن کے مضمون میں سردی کے ہاتھوں راہبوں کے مرنے کی ایک قبیح رسم کا تذکرہ کیا ہے تو سرسید نے بیکن کی اتباع کرتے ہوئے ایک یا دو مثالیں نہیں بلکہ تین سے چار مثالیں دے کر اپنے موقف کو زیادہ وضاحت سے پیش کیا ہے۔ بیکن کی مانند اس مضمون میں سرسید اک موقف رسوم ورواج کے بارے میں زیادہ واضح ہے۔ سرسید نے اس مضمون میں لمبے فقرات کے ذریعے اپنی انشا نگاری کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ان کے جملے بیکن کی مانند کئی کئی تراکیب پر مشتمل ہیں۔

افتراکات:

اس مضمون میں اشراکات کے ساتھ بہت سے افتراکات سے بھی سامنا ہوتا ہے۔ گو بیکن کی مانند سرسید نے بھی مثالیں دینے کی کوشش کی ہے مگر سرسید کا اپنے موقف پر جمے رہنے کا رویہ بوجھل کیفیت پیدا کرتا ہے۔ سرسید کی مثالیں بہت زیادہ توضیح کے باعث بھونڈے پن کی علامت بن جاتی ہیں اور مضمون میں خوبصورتی کی بجائے بدصورتی بن جاتی ہے۔ بیکن نے اپنے مضمون میں ناصحانہ انداز اختیار نہیں کیا اور نہ ہی اپنے موقف کی وضاحت کے لیے مذہبی مثالیں پیش کی ہیں۔ اس کے برعکس سرسید کا انداز مضمون نگار کی بجائے ایک مبلغ کا سا دکھائی دیتا ہے۔ سرسید کا انداز خطابیہ اور بیکن کا انداز بیانیہ ہے۔ سرسید نصیحت کے ذریعے اپنے قومی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہیں جبکہ بیکن کے نزدیک کسی مقصد کے حصول کی بجائے محض اپنی ادبی صلاحیت کا اظہار ہے۔

:Off Innovations

اس مضمون میں بیکن نے سائنسی اختراعات اور ایجادت کے مضمرات سے متعلق بات کی ہے۔ اس کے مطابق سائنسی اختراعات وایجادات خواہ کتنی ہی مفید کیوں نہ ہوں انسان پہلی بار ان کو اپنانے سے کتراتا ہے۔ کیونکہ انسان فطرتاً قدامت پسند واقع ہوا ہے اور اپنے مروجہ عادات واشیا سے جان چھڑانا اس کے لیے آسان بات نہیں۔ اس لیے اس سلسلے میں کی منطق یہ ہے کہ ایجادات کو معاشرے میں متعارف کروانے کی ذمہ داری ریاست اپنے سر لے۔ اس طور سائنسی ترقی پر دوں بھی نہیں لگے ایور معاشرے میں ان ایجادات کے حوالے سے رویوں میں اجنبیت بھی نہیں پیدا ہو گی۔ اس طرح ایک متوازن اور ترقی یافتہ معاشرہ قائم کرنے میں مدد ملے گی۔

اس مضمون میں حسب سابق انتہائی بلند پایہ خیالات کو خوبصورت، مکمل اور طویل فقروں میں سمویا گیا ہے۔ جو مختصر حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اس مضمون میں فکری جواہر کے ساتھ ساتھ اسلوب وبیان کی بے اندازہ قوت کے مظاہر یکساں طور پر قاری کو متاثر کرتے ہیں۔ کچھ دیگر مضامین کی دیگر بیکن کے اس مضمون میں فکر وتدبر گہرے مظاہر دیکھنے میں آتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے خیالات کے ساتھ فقروں کی بندش اور طوالت کا حساب بیکن کے ذہن میں پہلے سے موجود ہے۔ بیکن کے مضمون میں یہ عنصر اتنا طاقتور ہے کہ مضمون جو مغرب میں ایک ہلکا اور بے صرف صنف ادب شمار ہوتا تھا۔ بیکن کی طبع آزمائی کے بعد انتہائی اعلیٰ ادبی فنون میں شمار ہونے لگا تھا۔ اس مضمون کا پہلا فقرہ جہاں دعوت فکر دیتا ہے۔ وہ اسلوب بیان کے لحاظ سے بیکن کے انداز سخن کا بھی شاہکار محسوس ہوتا ہے۔

> As the births of living creathers at first are ill-shapen, so are all innovations, which are the binth of time.[۱۳]

اس فقرے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی مدد سے جہاں مضمون کو سمجھنے میں آسانی رہتی ہے وہاں خیالات کو بہتر تقسیم کے ذریعے ہم اس کی بہتر تقسیم کے قابل ہوسکتے ہیں۔

اس مضمون میں بیکن نے خالصتاً اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور مثالیں دینے سے گریز کیا ہے۔ جس کی بہر حال ضرورت نہیں تھی۔ بیکن کا انداز رجائیت بھرا اور خوبصورت ہے۔ جو قاری کے اندر خوشی اور اطمینان کا احساس پیدا کرتا ہے۔

یہ مضمون ریاست کے اختیارات بڑھا کر انہیں عام انسانوں کے لیے فائدہ مند ثابت کرنے کے متعلق بحث کرتا ہے۔ اس مضمون کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیکن نے اپنے خیالات کو سائنسی انداز دینے کی پوری کوشش کی ہے۔ طویل جملے جہاں ان کی انگریزی زبان پر مہارت ظاہر کرتے ہیں وہاں یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جملوں کی طوالت ابلاغ کے پہلو پر مطمئن کوئی اثر نہیں ڈالتی۔

"علوم جدیدہ" سرسید احمد خان کا مضمون ہے جس میں سرسید نے بیکن کے مضمون Of Imovations سے متعلق بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ سرسید ایک مصروف اور ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ اس لیے اپنی مصروفیات کی وجہ سے وہ بیکن کے اس مضمون کا ماضی الضمیر سمجھنے سے قاصر رہے۔ بیکن کا مضمون Of Imovations سرسید کے مضمون کے برعکس ایجادات کے تناظر میں لکھا گیا۔ اس مضمون میں علوم جدیدہ سے متعلق اپنے موقف کی سرسید نے خود وضاحت کی ہے۔ یہ مضمون بے حد مختصر ہے۔ جس میں سرسید نے تین نکات میں علوم جدیدہ کے غرض وغایت اور اقسام بیان کی ہیں۔ مضمون کے جملے مختصر اور متناسب ہیں۔ بیکن کی طرح غیر جذباتی اور منطقی انداز علوم جدیدہ کی پہچان ہے۔ سرسید نے اس مضمون میں بیکن کی طرح مثالیں دینے سے گریز کیا ہے۔ ہر چند دونوں مضامین کا نقش مضمون ایک دوسرے سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ اس مضمون میں سرسید نے بیکن کے انداز کی نقل کرتے ہوئے انتہائی اہم نکات کی مختصر مگر جامع تعریف کی ہے۔ جو سرسید کے انداز کے برعکس بیکن کا انداز زیادہ لگتا ہے۔

اشتراکات:

اس مضمون میں نفس مضمون کی بجائے انداز تحریر اور طرز فکر میں اشتراکات زیادہ نمایاں اور واضح ہیں۔ بیکن نے اپنے مضمون میں ایجادات کے معاشرتی پس منظر کا جائزہ لیا ہے اور اختراعات کے اثرات بیان کیے ہیں۔ اسی طرح سرسید نے اپنے اکثر مضامین میں استعمال ہونے والے ایک مختصر مگر پر معنی اصلاح کی

وضاحت کی ہے۔ بظاہر دونوں کا موضوع مختلف ہے مگر انداز فکر کے علاوہ چند چیزیں دونوں میں اشتراک پیدا کرتی ہیں۔ الفاظ کی نشست و برخاست بیکن کی طرح واضح اور بغیر شک و شبے کے ہیں۔

افتراکات:

مضامین کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مضامین میں چند اشتراکات کے علاوہ زیادہ تر افتراکات ہیں۔ دونوں مضامین موضوع کے اعتبار سے بالکل الگ الگ محسوس ہوتے ہیں۔ اگرچہ انداز تحریر میں چند چیزیں مشترک ہیں مگر پھر بھی بہت ساری چیزیں دونوں مصنفین کے درمیان فرق کی واضح علامت بن کر آتی ہیں۔ بیکن نے انسانی فکر و تدبر اور نفسیات کا اظہار کیا ہے۔ ان کا ہر جملہ وسیع تجربے کو بیان کرتا ہے جبکہ اس کے برعکس سرسید کا انداز عجلت پسندی سے عبارت ہے۔ سرسید نے عجلت میں ایک خبر نگار کی مانند اپنے موضوع کی سادہ لفظوں میں وضاحت کی ہے جبکہ بیکن نے سادہ الفاظ کی بجائے مرصع اور پر تکلف انداز اختیار کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی تحریر میں ابلاغ کا پہلو اپنی پوری آب و تاب سے نمایاں ہے۔

:Of Nobility

"Of Nobility" بیکن کا مضمون ہے جس میں مضمون نگار شرافت کے عوامی اور کاروباری پہلوؤں سے آگاہ کرتا ہے۔ اس کے مطابق شرافت اور اچھی شہرت انسان کے عوامی کردار کو درست کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اس کی مدد سے ایک انسان اپنے لیے اعلیٰ عہدوں کا حصول ممکن بنا سکتا ہے۔ مضمون نگار کا یہ مضمون، نفس مضمون کے لحاظ سے Of Enmy سے ملتا جلتا ہے۔

اس مضمون کا پہلا فقرہ حسب معمول ایک گہرا اور پر معنی فقرہ ہے۔ جس کی مدد سے مضمون نگار نے مضمون کے بقیہ حصوں کی جانب توجہ مبذول کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اس مضمون کے جملے طویل مگر مختصر حصوں میں تقسیم کیے ہوئے ہیں۔ مضمون نگار کا گہرا اور پر معنی تجزیہ اور انتخاب الفاظ مضمون کی قدر و قیمت میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ مضمون متناسب حصوں میں تقسیم ہے۔ آرائشی انداز کے باوجود افکار کی گہرائی اور فہم میں کمی واقع نہیں ہوتی۔

Of Nobility میں مصنف کے دانش مندانہ انداز کا پتہ دو طرح سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اول یہ کہ اس مضمون میں مصنف نے صرف ان باتوں پر بحث کی ہے جن کے بارے میں عموماً سب لوگ آگاہی رکھتے ہیں۔ مگر اظہار کی قدرت نہیں پاتے۔

سادہ مگر پر کیف انداز قاری کا دل موہ لیتا ہے۔ مختلف پہلوؤں کو یکے بعد دیگرے بیان کرنے کے بعد مصنف کی جامع رائے سے اختلاف کرنے کی گنجائش نہیں۔ اس مضمون کے اسلوب کی دوسری خاص بات انتہا پسندی اور فضول باتوں کے اظہار سے گریز کیا ہے۔ جو اس کے عمدہ طرز تحریر کی ایک اور مثال ہے۔ تحریر کی سنجیدگی مصنف کے وقار میں اضافہ کرتی ہے۔

سرسید کا یہ مضمون **"ہمارے روسا اور قومی بھلائی"** بیکن کے مضمون Of Nobility کی پیروی میں تحریر کردہ ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے برصغیر کے اہم لوگوں کی قومی ذمہ داری سے متعلق بات کی ہے۔ برصغیر کا خطہ نہایت ذرخیز اور خوبصورت ہونے کے باوجود صنعتی ترقی اور خوشحالی سے محروم ہے اور دولت کے وسیلے چند ہاتھوں میں مرتکز ہیں۔ سرسید کا مضمون رؤسا کے اچھے رویوں اور فراخ دلی کے اثرات پر بحث کرتا ہے جبکہ اس کے برعکس بیکن کا مضمون شرفا کو اہم عہدے دینے کی سفارش کرتا ہے۔ جس سے بیکن کا مطمع نظر ملکی حالات کو درست کرتا ہے۔ بیکن بڑے عہدوں کے پیچھے سازشوں اور حسد کے جذبے سے متعلق بات کرتا ہے اور سرسید عوامی فلاح و بہبود کے کاموں کی بات کرتا ہے۔

اشتراکات:

یہ مضمون چونکہ سرسید نے بیکن کے مضمون کی اتباع میں تحریر کیا ہے۔ لہٰذا دونوں مضامین میں موضوع کے ساتھ ساتھ مواد کی سطح پر بھی چند اشتراکات موجود ہیں۔ بیکن کی مانند یہ مضمون نوابوں رؤسا کے اچھے کاموں کا تذکرہ کرتا ہے۔ مگر سرسید نے عوامی بھلائی اور امن عامہ کو کسی حکومتی عہدے سے مشروط نہیں کیا۔ جبکہ بیکن ایسا کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ بیکن کے مطابق شرافت اور پارسائی انسان کی دقعت میں اضافہ کرتی ہے اور سرسید فلاح عامہ کے کاموں کے بغیر طاقت کو اچھا نہیں سمجھتا۔ بلکہ اس کی نظر میں مجبور کر کے کام کرنے والے اہل اقتدار جلد ہی اپنے تخت و تاج سے محروم ہو جاتے ہیں۔

افتراکات:

سرسید نے ہر چند یہ مضمون بیکن کی اتباع میں تحریر کیا ہے۔ مگر انھوں نے نفس مضمون کو اپنے ذہنی استعداد اور مقصد کے پیش نظر تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے۔ سرسید کا مضمون رؤسا کے قومی بھلائی کے امور میں دلچسپی کے عنصر کے بارے میں بحث کرتا ہے مگر اس کے برعکس بیکن کا مضمون شرافت کو اقتدار تک پہنچنے کا ایک وسیلہ قرار دیتا ہے۔ بیکن کے مطابق اچھی شہرت اور شرافت عہدوں اور مال و دولت کے حصول میں معاون ہے۔ مگر سرسید اپنے علاقوں کے نمایاں لوگوں کو قومی بھلائی کے کاموں میں دلچسپی کو ایک اہم عنصر گردانتے ہوئے ایسے امور میں دلچسپی لینے کو بہتر خیال کرتا ہے۔ اس مضمون میں سرسید کے جملے اپنے موضوع سے ہٹ کر دیگر موضوعات کو بیان کرتے ہیں۔ بیکن نے اپنے مضمون میں حسب روایت نپے تلے انداز میں اپنا ماضی الضمیر بیان کیا ہے۔ دونوں مضامین یکساں موضوع ہوتے ہوئے بھی زیادہ اختراکات رکھتے ہیں۔

سرسید احمد خان کا مضمون **"عزم جزم"** تعلیم و تربیت کے حوالے سے مصمم ارادے یا فیصلے پر بحث کرتا ہے۔ سرسید احمد خان کے مطابق یہی مصمم ارادہ جسے مضمون میں عزم جزم کے نام سے موسوم کیا گیا ہے دنیاوی و خروی کامیابی کا باعث ہے۔ سرسید اس بات کی اہمیت سے اچھی طرح سے جائزہ لینا اور اس میں مضمر نفع و نقصان کا اندازہ کرنا بے حد ضروری ہے۔ اس مضمون میں خیالات کی رو میں بہتے ہوئے سرسید نے عزم جزم کے تمام پہلوؤں میں اپنے نقطہ نظر کو واضح کیا ہے۔ اکثر فقرے لمبے اور کئی کئی تراکیب پر مشتمل ہیں جو اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ سرسید اپنے نقطہ نظر کی وضاحت اور اپنی بات کو دوسروں پر لاگو کرنے کے لیے کوئی بھی دلیل بروئے کار لا سکتے ہیں۔ تاریخی مثالیں دیتے ہوئے ان کا انداز داستانوی ہو جاتا ہے اور اس کے بعد وہ ایک ہی نتیجہ نکالتے ہیں جو ان کی مرضی و منشا کے عین مطابق ہوتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں کہ:

دنیا میں ایسے بے رحم اور قاتل سفاک غارت گر گزرے ہیں جنھوں نے ایسے ایسے بے رحم کام کیے ہیں جن کو سن کر انسان حیران رہ جاتا ہے مگر ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس نے یہ تہیہ نہ کر لیا ہو کہ میں کیا ہوں گا اور کیا کروں گا۔ پس سعادت حاصل کرنی چاہو یا شقاوت سب کی جڑ اسی امر کا تصفیہ کر لینا ہے کہ میں کیا ہوں اور کیا کروں گا۔[۱۴]

سر سید نے اس مضمون میں حسب معمول انسانی نفسیات اور معاشرے کے رواج سے قطع نظر اپنی بات کو اہمیت دی ہے اور بیکن کے مانند انسانی نفسیات کو سمجھے بغیر اپنا فیصلہ صادر کیا ہے۔ مضمون میں معقول تاریخی واقعات یا اقوال مضمون سے زیادہ اپنی علمی اظہار کا ذریعہ زیادہ محسوس ہوتے ہیں۔

بیکن کا مضمون Of Ambition توانائی رکھنے والے پر جوش لوگوں کے بارے میں ہے۔ ایسے لوگ جو کسی مقصد کے تحت کچھ کر دکھانے کا عزم رکھتے ہیں۔ بیکن کے نزدیک ایسے لوگ بہت خطرناک ثابت ہوتے ہیں کیونکہ انہیں عوامی ذمہ داری سے زیادہ اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا زیادہ شوق ہوتا ہے۔ اس لیے انہیں ایسی ذمہ داریاں نہیں سونپی جاسکتی جو انہیں ان کے مقاصد کی تکمیل میں معاون ثابت ہو جائیں۔ پر جوش اور بے چین لوگ عام لوگوں کی سوچ سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ اس لیے ایسے لوگوں کے لیے بادشاہ یا حکام بالا کو ایسے میدان تلاشنے چاہیں جو لامحدود اور بڑے ہوں تاکہ ان کی مدد سے ان کے جذبہ شوق کی تسکین ہو اور حکومت کے لیے براہ راست خطرہ بھی ثابت نہ وہ۔ بیکن کا مضمون بادشاہوں کو راستہ دکھانے یا مشورہ دینے سے متعلق ہے۔ اس مضمون میں لوگوں کی نفسیات سے متعلق ان کے علم کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ بیکن ایک طویل عرصے تک وکالت کے علاوہ حکومتی اداروں میں بڑے عہدوں پر فائز رہے ہیں۔ ایسے عہدے لوگوں کی نفسیات سمجھے بغیر ہاتھ نہیں آتے۔ لہٰذا ان کے نفسیاتی علم کی داد دینی پڑتی ہے۔ مذکورہ مضمون میں لمبی لمبی تراکیب کی مدد سے بنائے گئے جملوں پر مشتمل ہے۔ وہ ایک ہی جملے میں اپنے مقصد کو پوری طرح واضح کر دیتے ہیں۔ جملہ پورا ہونے سے قبل ان کے جملوں میں ابلاغ کی تلاش نہایت مشکل امر ہے۔ جملوں کی بندش

نہایت مضبوط ہے اور ان کا پیغام انتہائی واضح۔ بیکن نے پہلے پیراگراف کے بعد دوسرے پیراگراف میں پر جوش اور مکار لوگوں کی پہچان بتائی ہے اور یہ بھی کہ کس طرح ان لوگوں کی پہچان کی جاسکتی ہے۔

اشتراکات:

سرسید کا مضمون **"عزم جزم"** انسان کی مصمم ارادے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مثبت نتائج کے بارے میں ہے۔ جبکہ کہ اس کے مقابلے میں بیکن کا مضمون پر جوش اور کچھ کر دکھانے والے لوگوں کے بارے میں ہے۔ سرسید کا مضمون انسان کے مصمم ارادے کو واضح کرتا ہے جبکہ بیکن کا مضمون ارادے سے زیادہ ان لوگوں کی پہچان کے بارے میں بتاتا ہے۔

دونوں مضامین میں موضوع کے علاوہ نفس مضمون میں بھی چند اشتراکات دکھتے ہیں جیسے کہ ارادے اور انسان کے مابین فرق ہو سکتا ہے۔ جذبے اور انسان دونوں کی پیائش الگ الگ پیمانوں سے ہوتی ہے۔ یا روح اور مادے کو الگ الگ دیکھا جاتا ہے۔ ویسے ہی سرسید کا مضمون بیکن کے مضمون سے مختلف ہے۔ مگر اختلاف کے باوجود دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں کیونکہ روح اور مادے یا جذبے اور انسان کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا ممکن نہیں ہے۔

پہلا مضمون جس میں سرسید نے انسان کے عزم اور ارادے کے بارے میں بتایا ہے۔ دوسرے مضمون میں پر جوش اور پر عزم لوگوں کی توضیح سے متعلق ہے۔ اس طرح ان دونوں کو الگ الگ کھنگال کر دیکھا جاسکتا ہے۔

افتراکات:

سرسید کا مضمون **"عزم جزم"** بیکن کے مضمون سے الگ ہے۔ جس کے چند اسباب مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ پہلا مضمون انسان کے پختہ ارادوں کو ظاہر کرتا ے۔ سرسید ان انسانوں کی قدر کرتے ہیں۔ دوسروں کو ایسا بننے کی تلقین کرتے ہیں۔ کیونکہ اپنے کام سے جنون کی حد تک محبت کرنا انسانی فطرت میں شمار ہوتا ہے۔ یہی ایک وجہ ہے جو انسانوں اور حیوانوں کو ایک دوسرے سے ممیز کرتا ہے۔

۲۔ بیکن کہ سرسید کے مضمون کے طویل فقروں میں ابہامات جنم لیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے اس مضمون کو لکھتے وقت عزم جزم کے بارے میں ان کے افکار یا الفاظ دیگر توجیہات میں سفافیت نہیں ہوتی تھی۔

سرسید نے ابتدا میں مضامین لکھتے وقت بیکن کے سانچے اور خیالات کو سامنے رکھا۔ اس وقت انگریزی ادب میں بیکن کے طرز نگارش کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ لہٰذا یورپی اور مشرقی ممالک میں ان کے مضامین کی طرز پر لکھنے کی کوشش ہو رہی تھی۔ مختلف سماجی دائروں کے باوجود سرسید اور بیکن کے انداز نگار پر مشترک چیزوں کی تلاش نہایت آسان ہے۔ سرسید کے مضامین دو طرح سے اشتراک اور فرق رکھتے ہیں۔ بیکن ایک ترقی یافتہ مغربی معاشرہ کا پروردہ ذہن رکھنے والا مضمون نگار ہے۔ جب کہ سرسید انتہائی مشرقی اور ایک معزز مسلمان گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے دونوں کا تہذیبی فرق نمایاں طور پر نظر آتا ہے۔ بیکن کے مضامین میں فلسفہ اور دانش پورے طور پر انسان کو متاثر کرتی ہے۔ جبکہ متاثر کرنے کے لیے سرسید کے پاس بجز واعظانہ انداز اختیار کرنے کے اور کچھ نہیں ہے۔ سرسید کا انداز گفتگو شریفانہ اور اصلاح پر مبنی ہے۔ جبکہ اس کے مقابلے میں بیکن کا طرز نگار میکاولی کی طرز فکر کو جنم دیتا ہے۔ بیکن نے اپنے مخصوص انداز کو اپنے ہر مضمون میں قائم رکھا ہے۔ جبکہ سرسید مضمون کی ساخت اور موضوع کی سنجیدگی کے باعث الگ الگ طریقہ کار اختیار کرتے ہیں۔ سرسید کے مضامین کو بیکن کے مضامین کے طبع زاد تراجم بھی کہا جا سکتا ہے۔ سرسید ایک ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ ان کی زندگی مسلمانوں کی معاشی اور سیاسی سدھار کی تاریخ بتاتی ہے۔ تعلیمی اداروں کے قیام اور مختلف سوسائٹیوں کے تاسیس کے علاوہ انھوں نے ادب کا رخ تبدیل کرنے کی ایک منظم تحریک چلائی۔ اس وجہ سے ان کی زندگی میں فرصت کے لمحات نہایت کم تھے۔ بیکن بھی سرسید کی مانند ایک مصروف شخص تھے مگر ان کی بھاگ دوڑ میں ذاتی منفعت کا پہلو زیادہ نمایاں تھا۔ مضامین لکھتے وقت بیکن نے حصول اقتدار کا راستہ چھوڑ کر خالصتاً اپنے آپ کو ادب کے لیی مختص کر دیا تھا۔ اس لیے ان کے بعض مضامین میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں بھی کی گئیں۔ یہ ان کے خیالات میں تبدیلی کے طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ جبکہ اس کے برعکس سرسید اپنی پوری زندگی میں فراغت اور آرام سے آشنا نہ ہوئے۔ اس لیے ان

کے طرز نگارش میں جلد بازی اور اپنی بات پر زور دینے کا پہلو زیادہ پایا جاتا ہے۔ سرسید سے قبل اپنی علمی وجاہت کے اظہار کے لیے نہایت مرقع نثر لکھے جانے کا رواج موجود تھا۔ مگر سرسید نے اردو کو ابلاغی زبان بنانے اور عام فہم بنانے کے لیے آسان سے آسان طرز کو اختیار کیا تاکہ وہ اپنا مطمع نظر زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا سکیں۔ بیکن کے پیش نظر چونکہ کوئی ایسا مقصد نہ تھا لہٰذا انھوں نے انتہائی پر تکلف اور آرائشی طرز اختیار کیا۔ ان کا انداز عام لوگوں کے لیے قابل فہم نہ تھا۔ بلکہ بیکن نے شعوری کوشش کے ذریعے طبقہ اشرافیہ کو بالواسطہ پیغام دینے کی کوشش کی۔ سرسید نے مضامین میں تمہیدی اور جامع انداز اختیار کرنے کی بجائے طوالت کے ساتھ اس موضوع کے تمام پہلو واضح کیے ہیں۔ چند مضامین میں اختصار اور جامعیت بھی ہے مگر حد سے زیادہ مقصدیت اور سنجیدگی بے زاری کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ اس کے برعکس طویل فقرات میں بیکن نے منظری تسلسل کا پوری طرح سے خیال رکھا اور کسی خیال کو دوبارہ ادا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان کے ہر جملے میں الگ الگ خیال موجود ہے جو آخر میں نتیجے کی بجائے دو پہلوؤں کو سامنے رکھ کر قاری کو دعوت فکر دیتا ہے اور اپنا راستہ اپنانے کے لیے بیکن کے دیئے گئے دلائل میں سے کوشش کرنے کا اختیار دیتا ہے۔ بیکن کا کمال یہ ہے کہ اختصار کی حتی المکان کوشش کے باوجود جہاں مثال دینے کی ضرورت پیش آئی وہاں مختصر مگر دل پذیر مثالوں سے قاری کا دل موہ لیا۔ سرسید کی مثالوں میں ادبی پہلو سے زیادہ واعظانہ انداز نظر آتا ہے۔ انگریزی طرز معاشرت سے بہت زیادہ متاثر ہونے کی وجہ سے انجیل اور تورات کے حوالہ جات قرآن مجید سے زیادہ ہیں۔ چند جگہوں پر ہندوؤں کی مقدس کتب سے بھی اقتباسات اور حوالے موجود ہیں۔ مگر سرسید کے حوالہ جات بعض جگہ اتنے زیادہ ہو جاتے ہیں کہ ان میں ربط اور تسلسل قائم نہیں رہتا۔ بیکن کی مثالیں برجستہ اور موضوع کے اعتبار سے انتہائی متناسب ہیں۔ جو مضمون میں بیزاری سے زیادہ خوبصورتی کا باعث بنتی ہیں۔ بیکن کا ایک کمال یہ ہے کہ اس نے مرصع زبان کے استعمال کے باوجود فقروں کے ابلاغ میں کسی طرح کا ابہام آنے نہیں دیا۔ حالانکہ جب زبان کی ظاہری صورت پر توجہ مرکوز ہو جاتی ہے تو اکثر اوقات اس قسم کے مسائل سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس خیال کو یوں بھی ظاہر کیا جا سکتا ہے کہ ابلاغ اور ظاہری خوبصورتی دونوں اعتبار سے بیکن کے فقرے اپنی مثال آپ ہیں۔ سرسید مقصدیت کے پیش نظر آسان سے آسان تر زبان استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور کوئی مثال سامنے نہ ہونے کے باوجود ان کی یہ کاوش اردو ادب کی آئندہ ترقی کے لیے

ایک بیش بہا خدمت تھی مگر اپنی بات تو صحیح طور پر عوام الناس کے سامنے پیش کرنے کے لیے مثالوں کے بے محابا استعمال نے ان کی انشا نگاری کی صلاحیت کو گہنا دیا ہے مگر ایک اصلاح کار کے طور پر انہیں نثر میں تاہم مقام حاصل کرنے سے زیادہ حصول مقصد سے زیادہ لگاؤ رہا۔ بہر حال دونوں مضمون نگاروں نے اپنے اپنے وقت میں ادب کو ایک سمت دینے اور متاثر کرنے کی کامیاب کوشش کی۔

حوالہ جات

1. Sir. Francis Baco, Bacon Essay, Published by New Kitaab Mahal & Urdu Bazaar, Lahore, Edition 1975, P. 229

۲۔ اسماعیل پانی پتی، محمد، مقالات سرسید حصہ پنجم، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۱

3. Sir. Francis Baco, Bacon Essay, Published by New Kitaab Mahal & Urdu Bazaar, Lahore, Edition 1975, P. 327

۴۔ اسماعیل پانی پتی، محمد، مقالات سرسید حصہ پنجم، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۹۰ء، ص

5. Sir. Francis Baco, Bacon Essay, Published by New Kitaab Mahal & Urdu Bazaar, Lahore, Edition 1975, P. 294

۶۔ اسماعیل پانی پتی، محمد، مقالات سرسید حصہ پنجم، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۹۰ء، ص ۳۳۷

۷۔ اسماعیل پانی پتی، محمد، مولانا، مقالات سرسید، حصہ ہفتم، طبع دوم، اپریل ۱۹۹۱ء، ص ۲۱۱

8. Sir. Francis Baco, Bacon Essay, Published by New Kitaab Mahal & Urdu Bazaar, Lahore, Edition 1975, P. 346

۹۔ اسماعیل پانی پتی، محمد، مولانا، حصہ دوازدہم، مجلس ترقی اردو، لاہور، طبع دوم، جون ۱۹۹۳ء، ص ۹۲

۱۰۔ اسماعیل پانی پتی، محمد، مولانا، مقالات سرسید، حصہ ہفتم، طبع دوم، اپریل ۱۹۹۱ء، ص ۱۱

11. Sir. Francis Baco, Bacon Essay, Published by New Kitaab Mahal & Urdu Bazaar, Lahore, Edition 1975, P. 327

12. Sir. Francis Baco, Bacon Essay, Published by New Kitaab Mahal & Urdu Bazaar, Lahore, Edition 1975, P. 358

13. Sir. Francis Baco, Bacon Essay, Published by New Kitaab Mahal & Urdu Bazaar, Lahore, Edition 1975, P. 346

۱۴۔ اسماعیل پانی پتی، محمد، مولانا، مقالات سرسید، حصہ ہفتم، طبع ۱۹۹۰ء، ص ۱۵۰

باب پنجم:

مجموعی جائزہ

مضمون یونانی زبان کے لفظ آرتھرن سے اخذ کیا گیا ہے جس کے معنی جوڑ کے ہیں۔ یہ لفظ اپنی اصل صورت میں آج بھی مستعمل ہے۔ اپنے خیالات کو ایک منظم تحریر صورت میں لکھ کر لوگوں کے سامنے پیش کرنے کو مضمون کہا جاتا ہے۔ مضمون دراصل اپنے خیالات اور تجربوں کو مختلف انداز میں بالترتیب جوڑ کر لکھنے کو کہتے ہیں۔ مضمون عنوان کے تحت تحریر کیا جاتا ہے۔ یہ صنف ادب روز بروز ترقی کرتی جارہی ہے۔ جس کے تحت لوگ کسی بھی عنوان سے اپنی رائے کو عوام کے سامنے پیش کرتا ہے۔ اس کے لغوی معنی ضمناً لیا ہوا یا میان میں ڈالی ہوئی کسی چیز کو کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی اس کے کئی مطالب مختلف لغات میں موجود ہیں۔ کسی موضوع پر لکھنے کے لیے خوبصورت مرصع اور دلربا انداز میں لکھنے کی روایت اردو میں بہت قدیم ہے مگر جدید مضمون نگاری کو اردو میں متعارف کروانے کا سہرا سرسید احمد خان کے سر ہے۔ مضمون نگاری کی جدید روایت کا آغاز فرانس سے ہوا۔ جب ایک فرانسیسی مفکر مونٹین نے اپنے خیالات کو منظم انداز میں قلمبند کیا۔ بعد ازاں اپنے مضمون کا نام دیا گیا۔ عصر حاضر میں مضمون ایک منظم اور موثر صورت میں سامنے آیا ہے۔ جس نے لوگوں کو اپنے خیالات عوام تک پہنچانے میں مدد کی ہے۔ ادب کا تعلق انسانی ذہن کی گونا گونی سے ہے۔ نظم اور نثر دونوں میں ادیب اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے اور اپنے تجربے کو بیان کرتا ہے۔ ادب ادیب کے زاویہ نگاہ کا بھی عکاس ہوتا ہے۔ مضمون نگاری بھی نثر میں اس وجہ سے اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں افسانوں یا شاعری کے ذریعے مختلف کرداروں کے توسط سے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرتا بلکہ یہ مکمل طور پر فرد واحد کی سوچ کو منظم صورت میں سامنے لاتا ہے۔ نظم و نثر کی بقیہ اصناف مضمون کی طرح اس خوبی سے متصف نہیں ہوتیں۔ یوں تو جدید مضمون نگاری کا آغاز فرانسیسی زبان سے ہوا۔ مگر اس وقت طبقہ امر کے لوگ فرانسیسی زبان میں لکھنے کو قابل فخر سمجھتے تھے۔ فرانسیسی میں لکھنا پڑھنا اور بولنا انگلستان کی اشرافیہ کے لیے باعث افتخار تھا۔ لہٰذا بہت جلد ہی فرانسیسی کی طرح انگریزی زبان نے بھی مضمون نگاری نے جڑ پکڑ لی۔

مضمون نگاری کی روایت کو شروع کرنے میں رچرڈ سٹیل اور ڈینٹیل ڈیفو اور ایڈیسن کے علاوہ بہت سے دیگر مضمون نگار بھی اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر بیکن نے گزشتہ مضمون نگاروں کے برعکس اس صنف ادب سے انصاف کرنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ مضمون نگاری کی روایت میں بیکن وہ سنگ میل ثابت ہوا جس نے بعد میں آنے والے تمام مضمون نگاروں پر اپنا اثر قائم کیا۔ مضمون نگاری کی روایت میں بیکن اس قدر مضبوط حوالے کا مالک ہے کہ بیکن نے اس صنف کے جو اصول وضوابط مقرر کیے وہ بعد میں آنے والے تمام مضمون نگاروں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی۔

سترھویں صدی میں یورپی طالع آزماؤں نے ہندوستان کو فتح کرنے اور اس کے وسائل سے استفادہ کرنے کی جن کوششوں کا آغاز کیا تھا انیسویں صدی میں ان کی کوششیں بالآخر رنگ لے آئیں۔ ۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے فرانسیسیوں اور پرتگالیوں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے پورے ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کر دیا۔ ۱۷۹۹ء میں سلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد ہندوستان میں انگریزوں کے سامنے ایسی کوئی رکاوٹ نہ رہی جو ان کے اقتدار کے لیے کوئی بڑا خطرہ ثابت ہو سکے۔ ہندوستان میں آزادی کے لیے چھوٹی بڑی تحریکیں البتہ سر اٹھاتی رہتی تھیں۔ ان تحریکوں نے پچاس برسوں کے دوران منظم صورت اختیار کر لی اور بالآخر آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر المتخلص بہ ابوالظفر سراج الدین بہادر شاہ کی رہنمائی میں جنگ آزادی کا آغاز ہوا۔ ہندوستان کے طویل وعریض پر قابض انتہائی منظم انگریز سرکار نے معمولی جانی نقصان کے بعد بغاوت کچل دی اور مغلیہ سلطنت کو ختم کرتے ہوئے آخری مغل فرمانروا کو رنگون میں قید کر لیا۔ جہاں اس نے وفات پائی۔ اقتدار پر قبضے کے بعد ہندوؤں نے نئے آقاؤں سے تیزی سے راہ ورسم پیدا کی اور انگریزوں کی زبان اور تعلیم کو ممکنہ تیزی سے حاصل کر کے مسلمانوں کو سیاسی، سماجی اور معاشرتی میدانوں میں پیچھے چھوڑ دیا۔ سرسید وہ پہلے مسلمان راہنما تھے جنھوں نے اس کمی کو پوری شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ انھوں نے انگریزی تعلیم کو مسلمانوں کے لیے قابل فہم اور آسان بنانے کے لیے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ اول اول سائنٹیفک سوسائٹی اور محمڈن اینگلو اورینٹل سکولز کا آغاز انہی کوششوں کی کڑیاں تھیں۔ جس نے اردو ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ قبل ازیں اردو ادب ہندوستان سمیت وسطی ایشیا کی بیشتر زبانوں سے الفاظ وتراکیب کے

سلسلے سے استفادہ کر چکا تھا۔ اس لیے انگریزی زبان کو اختیار کرتے ہوئے انہیں کسی قسم کی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ دورہ انگلستان کے بعد سرسید تہذیب اینکلیس سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ انھوں نے بیداری شعور کے لیے اپنی کوششیں تیز تر کر دیں۔

سرسید نے اپنی گوناگوں مصروفیات میں سے وقت نکال کر انگریزی ادب اور معاشرت کا گہرا مطالعہ کیا۔ اپنی ہمہ جہت مصروفیات کے باعث انھوں نے پڑھنے لکھنے اور ادب کا ایک نیا نظریہ پیش کیا۔ انگریزی مضامین کی طرز پر اردو میں مضمون نگاری کی ابتدا بھی اسی فکر اور نظریے کے تحت سرسید نے مسلمانوں کی انتہائی ابتر معاشی اور معاشرتی صورتحال کے سبب اپنی مقصدیت کو اپنے ہر کام میں پیش نظر رکھا۔ لہٰذا مضمون نگاری کی روایت کا آغاز ہر چند ایک مضبوط اور کن ادب پسند شخصیت کے ہاتھوں ہوا۔ مگر مقصدیت کے سبب ایک بے زار یکسانیت ان کے مضامین میں ہر جگہ نظر آتی ہے۔ وہ اپنے مضامین کو اپنے مقصد کے تحت رکھتے تھے اور اس وجہ سے ان کے مضامین میں نثر کی وہ خوبیاں نمایاں نہیں ہو سکیں جو ہونی چاہیے تھیں۔ اردو میں مقصدیت کی روایت اتنی بے زار کن ہو چکی تھی کہ ان کی وفات کے فوراً بعد ہی رومانوی تحریک نے اثر دکھانا شروع کر دیا۔ رومانوی تحریک کا باقاعدہ آغاز شیخ عبدالقادر کے رسالے مخزن سے ہوا۔ سرسید کے رفقا میں شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد، مولانا حالی اور بعض دیگر اصحاب کے نام لیا جا سکتا ہے۔ ذہنی اور معاشی پس منظر کے الگ ہونے کے باوجود ان تمام افراد نے سرسید کی رہنمائی میں ایک نئے جذبے سے لکھا۔ تہذیب الاخلاق میں مضامین لکھتے وقت سرسید نے انگریز مضمون نگاروں رچرڈ سٹیل اور ایڈیسن کے علاوہ بیکن کا بالخصوص مطالعہ کیا۔ بیکن کے مطالعے کے دوران سرسید ان کی سوچ اور انداز نگار سے بے حد متاثر تھے۔ بیکن نے مضمون لکھتے وقت جن نفسیاتی اور تہذیبی قدروں کو مد نظر رکھا ان کا یہ میانہ رو انداز سرسید کے لیے بے حد باعث کشش تھا۔ اس وجہ سے سرسید نے شعوری اور لاشعور دونوں طریقوں سے بیکن کے مضامین کو نقل کرنے کی کوشش کی۔ سرسید سے قبل بھی دلی کالج کے چند مضمون نگاروں نے اس میدان میں اپنے قدم جمانے کی کوشش کی اور گہرے نقوش چھوڑے۔ مگر سرسید کا انداز نگارش آسان اور پر معنی ہونے کی بنا پر

زیادہ مشہور ہوا۔ سرسید کی مضمون نگاری کے میدان میں اولیت سے قطع نظر یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ ان کے مضامین کو بقیہ دیگر مضمون نگاروں کے برعکس زیادہ شہرت کیوں ملی جس کی بنیادی وجوہات یہ ہیں۔

اول یہ کہ سرسید صرف مضمون نگار ہی نہ تھے بلکہ ہمہ جہت سیاسی و سماجی شخصیت تھے۔ دوم یہ کہ سرسید ایک روشن خیال شخصیت تھے اور بہ نسبت زیادہ کام لیا۔ سوم یہ کہ انھوں نے ربط اور فراہمی معلومات کی بجائے اپنا نقطہ نظر بیان کرنے کو ترجیح دی اور چہارم یہ کہ انھوں نے آسان سے آسان الفاظ اختیار کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ پنجم یہ کہ ان کا دائرہ اثر دلی کالج کے مصنفین کی شہرت اور ان کی اولیت کے بارے میں بنیادی سوالات کے جوابات پر مشتمل ہیں۔

سرسید تحریک نے تقابل کی ایک مضبوط روایت قائم کی۔ اردو زبان اس سے قبل بھی فارسی، عربی اور ہندوستان کی دیگر زبانوں کے اثرات قبول کرتی رہی ہے مگر اثرات قبول کرنے کا یہ رجحان بالکل خاموش اور غیر محسوس انداز میں انجام پاتا رہا۔ جبکہ انیسویں صدی میں جب اردو زبان نے انگریزی زبان کو ایک وسیع زبان کے طور پر اپنانے کی کوشش کی تو اردو زبان میں لکھنے والے بیشتر ادیبوں نے انگریزی زبان میں مستعمل صنف ہائے ادب کو بعینہ اردو میں متعارف کروایا۔ انگریزی اصناف، تقابل اور تنقید کی روایت کو قائم کرنے میں مشکلات ضرور پیش آئیں مگر سرسید نے اپنی محنت اور مستقل مزاجی سے ان پر قابو پالیا۔

مضمون نگاری نثری ادب میں نہایت اہم مقام رکھتی ہے اور سرسید احمد خان کی ادبی زندگی میں مضمون نگاری کلیدی حیثیت کی حامل ہے۔ سرسید تاریخ کا گہرا شعور اور شغف رکھتے تھے۔ آئین اکبری کی ان سیر نوترکیبیں اور آثار ایضادید کی تصنیف ان کی اس دلچسپی کی بڑی مثالیں ہیں۔

اپریل ۱۹۶۹ء میں جب سرسید لندن وہاں پر رجسٹرڈ سٹیل ۵ اصلاحی مساعی نے انہیں بہت متاثر کیا۔ ہندوستان واپسی پر انھوں نے رسالے تہذیب الاخلاق کا اجرا کیا۔ اس رسالے نے کم و بیش وہی اصول اپنائے جو Tatles اور Spectatre کی اساس تھے۔ ۱۸۴۷ء میں جب سرسید نے اولین بات اپنی تاریخی تصنیف ''اثار العنادید'' شائع کی۔ مگر اسی تصنیف کو انھوں نے پہلے پس منظر کی وجہ سے نسبتاً آسان اور سادہ نثر میں دوبارہ لکھا اور اس میں وقت کے تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں بھی کیں۔ یہ ایڈیشن ۱۸۵۴ء میں دوبارہ شائع

ہوا۔ گویا ایک جہاں دیدہ رہنما کے بطور انھوں نے آسان نثر اور اپنی بات کی دوسروں تک بہ وقت اور صحیح رسائی کا جنگ آزادی سے کئی برس قبل اندازہ کر لیا تھا۔ جدید زمانے کا ساتھ نہ دینے اور تعلیم و معاشرت میں پیچھے رہ جانے کی بدولت برصغیر کا عمومی معاشرہ انتہائی فرسودہ ہو چکا تھا۔ عوام اپنی قبیح رسم ورواج سے بری طرح چمٹے ہوئے تھے۔ بغات کی ناکامی ایسا اثر آفرین واقعہ تھا جس نے برصغیر کے ہر کونے میں موجود لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا اور ان کی زندگی پر براہ راست اپنے اثرات مرتب کیے۔

اردو نثر، شاعری کی مانند ہر دور میں ضرورت کے مطابق اپنا لباس اور معاشرت تبدیل کرتی رہی ہے۔ اس لیے اجنبیت کا قطعاً احساس نہیں ہوتا۔ ۱۷۹۹ء میں فورٹ ولیم کالج نے آسان اور رواں نثر کو رواج دینے میں اپنا کردار ادا کیا۔ اس سے دوران دہلی میں غالب نے خطوط کے مروجہ اصولوں کو توڑ کر نئے اسلوب کی بنیاد رکھی۔ یہ اسلوب براہ راست بات کا تھا۔ خط کو مکالمے میں تبدیل کرنا اور داستانوں میں مسجعٰ و مقفع انداز کو بالائے طاق رکھ کر سیدھا سادہ اسلوب اختیار کرنا اسے واقعات تھے۔ جس نے ضرورت پیدا کی کہ آسان نثر کو روز مرہ کی گفتگو میں ہی اختیار نہ کیا جائے بلکہ اس میں بامقصد تبدیلیوں کی بھی گنجائش رکھی جائے۔ سرسید کے آسان نثر اختیار کرنے کے پیچھے یہی مقصد کار فرما تھا۔

برصغیر کی معاشرت اور سیاست انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں مکمل تباہی ہو چکی تھی۔ سرسید سمیت دوسرے مسلمانوں کو بھی اس امر کا مکمل احساس تھا۔ سرسید تحریک میں شامل دیگر رفقائے کار اس امر سے بخوبی واقف تھے کہ سیاست، اخلاقیات اور معاشرت کو نئی بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے پہلے موجود ڈھانچے کو مکمل زمین بوس کرنے کی ضرورت ہے۔ تاہم معاشرے میں موجود چند عناصر کی طاقت سے خوفزدہ یہ عناصر بذات خود کوئی قدم اٹھانے کو تیار نہ تھے۔ اس مقصد کے لیے انہیں ایک مضبوط سہارے اور پلیٹ فارم کی ضرورت تھی۔ جو سرسید کی رہنمائی میں انہیں میسر ہوا۔ جس کے توسط سے خواجہ الطاف حسین حالی، آزاد شبلی نعمانی و دیگر نے اپنے مخصوص میدانوں میں کامیابیاں حاصل کیں۔ ان تمام سرگرمیوں کا مقصد بنیادی طور پر اصلاح معاشرہ تھا۔ سرسید نے کمزوری اور ضعف کے باوجود تن تنہا اپنی ذات پر سب کچھ سہا اور مخالف قوتوں کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئے۔

ان کے مضامین میں اصلاح معاشرہ، اصلاح اخلاق، روشن خیالی، تعلیم کی اہمیت اور مذہب کی پیروی میں برداشت اور رواداری جیسے موضوعات نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ دورہ انگلستان نے ان کے خیالات سے گومگو اور ہیجانی کیفیت کو مکمل طور پر ختم کر دیا۔ انگریز تعلیم کا حصول ان کی نظر میں ایک ایسا عمل تھا جو موجودہ دنیا کو سمجھنے اور یہ کہنے میں سب سے زیادہ معاون ثابت ہو سکتا تھا۔ اس لیے ان کی تحریروں کے اصلاح معاشرہ کے بعد تعلیم کے حصول کا خواب سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ بحث و تکرار اور تعجب کے عنوان سے لکھے گئے مضامین کا موضوعاتی جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی معاشرے پر کتنی گہری نظر تھی۔ وہ طویل فقرے کہتے ہیں جس سے ان کا مقصد دلائل کے ذریعے لوگوں کو عمل کی ترغیب دینا ہے۔ نہ کہ اپنی علمیت اور نثر نگاری کی دھاک بٹھانا۔

ایڈسن اور بیکن کی انداز نگارش کا جائزہ لے کر انھوں نے انشائویسی کے ابتدائی نقوش تہذیب الاخلاق میں چھوڑے ہیں۔

بیکن سے سرسید بہت زیادہ متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کے بعض مضامین کو چربہ قرار دیا گیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ بیکن اور سرسید کی شخصیت اور کردار میں بہت زیادہ فرق ہے۔ فرانسس بیکن کی پیدائش برطانیہ کے نامور گھرانے میں ہوئی۔ اس کا والد نیکولیس شاہی ملازمت سے وابستہ تھا۔ اس وجہ سے بیکن کو بچپن ہی سے شاہی انداز واطوار بھانے لگے تھے۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ وہ ٹرینٹی کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے دوران اس نے عمومی رویوں اور رجحانات کو سائنسی تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی اور مضمون نویسی کے دوران اپنی دقت نظری کا بے مثال مظاہرہ پیش کیا۔ کیمبرج میں اس کی ملاقات ملکہ الزبتھ سے ہوئی جس نے ان کی ذہانت سے متاثر ہو کر اسے لارڈ کسپیر کا خطاب دیا۔ بیکن کے مختلف ممالک کے سفر نے اسے اپنا خلیقہ اثر بڑھانے اور تجربے کے اضافے میں بے پناہ مدد دی۔ فرانس میں ہینری سوم کو نہایت قیمتی مشورے دیئے۔ حکومتی ذمہ داریوں اور سفارتی اہداف کے حصول نے انہیں انسانوں کی پرکھ اور تعلیم و تہذیب کو سمجھنے میں بہت زیادہ مدد دی۔ اس دوران بیکن نے ان ممالک کی زبانوں سمجھنے میں کافی کامیابی حاصل کی۔

بیکن تمام عمر بڑے عہدوں، مال و دولت کے حصول اور جاہ و جلال کے ساتھ زندگی گزارنے کا خواہش مند رہا۔ اس کی زندگی میں یہ اصول تمام عمر رکھے مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ مذہب و ملک کی خدمت کرنا چاہتا تھا اور تمام عمر ان مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں رہا۔

اپنے مضامین کے ذریعے سچ کو آشکار کرنے، لالچ، دولت اور بڑے عہدوں کے درپردہ عوامل وہ خوب جانتا اور سمجھتا تھا۔ اس وجہ سے انسانوں کا کامیاب نفسیاتی تجزیہ کرنے میں اس کی مہارت اور دانش کمال تھی۔ ان کے مضامین کے موضوعات میں کچھ عام ہیں اور بعض دیگر موضوعات اچھوتے محسوس ہوتے ہیں۔ رسوم و رواج اور توہمات سے متعلق مضامین عام شمار کیے جاسکتے ہیں۔

مگر Of Ambitions، Of Enmy اور Of Inovations جیسے مضامین اپنے موضوع کی مانند غیر معمولی ہیں۔ سرسید کے ہر مضمون میں دلائل اور اقوال کے ساتھ ساتھ اشعار بھی نظر آتے ہیں۔ مگر موضوع کی طرح بیکن کے مضامین بھی غیر معمولی نوعیت کے ہیں۔

سرسید اور بیکن دو مختلف الخیال، زبان اور جغرافیائی لحاظ سے بھی مختلف ہیں اور زمانی لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے مگر چند وجوہات کی بنا پر ان کے مضامین میں مماثلت ضرور موجود ہے۔ یہ مماثلت چند اعتبار سے زمانی بھی ہے۔ لسانی بھی اور چند دیگر وجوہات بھی اس ضمن میں دی جاسکتی ہیں۔ سرسید اور بیکن موضوعات کے لحاظ سے کسی حد تک مماثل ہیں۔ مگر نفس مضمون کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ جس کی وجہ سے یہ ہے کہ بیکن نے کسی بہت بڑے معاشرتی و سیاسی مقصد کے حصول کے پیش نظر کوئی مضمون تحریر نہیں کیا۔ مگر سرسید کے مضمون کا یہ پیرایہ اختیار کیا ہے اس لیے غالب اس کی مدد سے اصلاح کا کام کیا جاسکے۔ سرسید اپنے دلائل کے حوالے سے جذباتی اور بیکن غیر جذباتی ہیں۔

سرسید کے انداز بیان میں مادی پہلو کے ساتھ ساتھ روحانی پہلو بھی ملتا ہے۔ مگر بیکن مذہب یا روحانی انداز بیان سے کوسوں دور ہے۔ بیکن آفاقی سچائیاں، نفسیاتی پہلوؤں کو مد نظر رکھ کر بیان کرتے ہیں۔ سرسید نفسیات کے بیان کی بجائے واعظانہ انداز اختیار کرتے ہیں۔ ان کے انداز میں سختی اور اپنے بات پر جمے رہنے کا پہلو بیکن کے پہلو سے مختلف ہے۔ سب سے بڑا فرق جو دونوں کے انداز نگارش میں فرق لاتا ہے وہ یہ کہ بیکن

نے اپنے مضامین اپنی علمی وجاہت کے اظہار کے لیے تحریر کیے جبکہ سرسید نے مضمون نگاری کو صرف اپنے مقاصد کے حصول کے لیے بطور آلہ استعمال کیا۔ ایک مماثلت جو دونوں کے انداز تحریر میں نظر آتی ہے وہ یہ کہ طویل طویل جملے ان کے موضوع پر گرفت کو بیان کرتے ہیں۔

سرسید اور بیکن دونوں نثر نگاروں نے اپنے اپنے وقت میں ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے اور ادب کے عمومی چہرے کی تہذیب کرنے میں مدد کی۔

نتائج

۱۔ سرسید کی مضمون نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے ان وجوہات کا پتا چلتا ہے جن کی وجہ سے معاشرتی اور معاشی میدان میں برصغیر میں تبدیلیاں رونما ہو رہی تھی۔

۲۔ سرسید نے شعوری طور پر بیکن کی مضمون نویسی کی پیروی کرنے کی کوشش کی۔ ان کا یہ پیروی مضمون نگاری کی روایت کو اردو ادب میں ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتی نظر آتی ہے۔

۳۔ سرسید تحریک کو کامیاب بنانے اور ان کی محنت شاقہ کو نتیجے تک پہنچانے میں مضمون نگاری کلیدی اہمیت کی حامل ہے۔

۴۔ سرسید اور بیکن کے مضامین کا تقابلی جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ سرسید اور بیکن کن وجوہات کی بنا پر ایک دوسرے سے مماثلت اور اختلاف رکھتے ہیں۔

سفارشات

درج ذیل کام کو مد نظر رکھتے ہوئے آئندہ تحقیقی کام کے لیے چند اہم سفارشات پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ آج کی دنیا ایک عالمی گاؤں کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ جس میں زبانیں اور ادب ایک دوسرے کے قریب آرہے ہیں۔ دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں میں تقابل کی ایک مضبوط روایت موجود ہے۔ مذکورہ مقالہ کمزور پڑتی اس روایت کو اردو ادب میں زندہ کرنے میں مدد دے گا۔

۲۔ سرسید کی مضمون نگاری کے علاوہ ادب کے دیگر شعبوں میں بھی اثرات ہیں جن پر تحقیق کی جانی چاہیے۔

۳۔ سرسید کے علاوہ انگریزی ادب کا دیگر مصنفین پر بھی گہرا اثر ہے۔ تقابل کی مدد سے ان وجوہات اور اثرات کا جائزہ لیا جانا چاہیے۔

کتابیات

بنیادی ماخذات:

مولانا اسماعیل پانی پتی، مقالات سر سید، مجلس ترقی ادب لاہور، جون ۲۰۰۱ء

سر سید احمد خان، تہذیب الاخلاق، اپریل ۱۹۹۱ء

سر سید احمد خان، تہذیب الاخلاق (حصہ سوم)، اپریل ۱۹۹۱ء

غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر، مضامین سر سید، منتخبات تہذیب الاخلاق، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۳ء

Joseph Addison. Tatler Vol 1 edited by Henery Morley 1891.

No. 1- Thursday, March 1, 1711-Addison

No. 2- Friday, March 2, 1711-Steele

No. 3- Saturday, March 3, 1711-Addison

No. 4- Monday, March 5, 1711-Steele

No. 5- Tuesday, March 6, 1711-Addison

No. 6- Wednesday, March 7, 1711-Addison

No. 7- Thursday, March 8, 1711-Addison

No. 8- Friday, March 9, 1711-Addison

No. 9- Saturday, March 10, 1711-Addison

No. 10- Monday, March 12, 1711-Addison

No. 11- Tuesday, March 13, 1711-Steele

No. 12- Wednesday, March 14, 1711-Addison

Joseph Addison. Tatler Vol 2 edited by Henery Morley 1891.

Sir Francis Bacon, Bacon Essays, Published by New Kitaab Mahal, Urdu Bazaar Lahore, Pakistan.

ثانوی ماخذ:

ابرار رحمانی، ڈاکٹر، کلیم الدین احمد کی تنقید کا تنقیدی جائزہ، تخلیق کار پبلشرز، 104 لکشمی گھر، دہلی، ۱۹۹۹ء

ابو بقاوری محمد، ڈاکٹر، اردو نثر کے ارتقا میں علما کا حصہ، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

احسن فاروقی، محمد، ڈاکٹر، تاریخ ادب انگریزی، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶ء

اختر الواسع، سر سید کی تعلیمی تحریک، مکتبہ عالیہ، ایبک روڈ، لاہور، ۱۹۹۱ء

ارشد علی، تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، آثار الفساد ید، آواز عالمگیر ایجوکیشنل پبلشرز، خواجہ، مارکیٹ جہلم، جولائی ۱۹۹۸ء

اشفاق سلیم مرزا، تاریخ سیاسی فکر مکیاولی سے گرامچی تک، ایک مطالعہ اور انتقاد، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء

افضالہ شاہین، قارینہ ادب، سرمد اکادمی اٹک، اگست ۲۰۱۱ء

اکرام چغتائی، محمد، مطالعہ سر سید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء

اکرام چغتائی، محمد، مضامین سر سید، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸ء

اکرم چغتائی، محمد، مضامین سر سید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء

الطاف حسین حالی، مولانا، حیات جاوید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۷۹ء

الطاف حسین حالی، مولانا، سر سید احمد خان سوانح، پبلشرز یونائیٹڈ لمیٹڈ، انار کلی لاہور

الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری، ۱۹۸۷ء

امداد امام اثر، سید، کاشف لحقائق، مرتبہ ڈاکٹر وہاب اشرفی، ترقی اردو بیورو نئی دہلی

انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، اردو مرکز لاہور

انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۹۱ء

ایڈورڈ ڈبلیو سعید، مشرقی شناسی، مترجم محمد عباس، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان

جمیل جالبی، ڈاکٹر، جلد چہارم، تاریخ ادب اردو، مجلس ترقی ادب، لاہور، پرنٹنگ پریس، نیسٹ روڈ، لاہور

جمیل یوسف، سر سید احمد خان، فن اور شخصیت، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء

حالی، الطاف حسین، "حیات جاوید"، جلد دوم، نامی پریس کانپور، ۱۹۰۱ء

خلیق احمد نظامی، پروفیسر، سر سید کی فکر اور عصر جدید کے تقاضے، انجمن ترقی اردو (سنید)، نئی دہلی، ۱۹۹۳ء

رام بابو سکینہ، "تاریخ ادب اردو"، غضنفر اکیڈمی، کراچی، س ن

رامن سیلڈن، نظریہ ادب کے رہنما اصول، مترجم: اعراز باقر، مقتدرہ قومی زبان، پاکستان، ۲۰۱۲ء

سلطان محمود، سید، اردو کی نثری تاریخ میں سر سید کا مقام، فیروز سنز، لمیٹڈ لاہور، ۱۹۷۱ء

سکسینہ، رام بابو، تاریخ ادب اردو، جلد اول، علمی بک ہاؤس اردو بازار، لاہور، ۱۹۸۱ء

سید عبد الحق، ڈاکٹر وجہی سے عبد الحق تک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

سید عبد اللہ، ڈاکٹر، اشارات تنقید، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۱۹۸۶

سید عبد اللہ، ڈاکٹر، طیف نثر، مرتب ڈاکٹر ممتاز منگلوری، لاہور اکیڈمی، ۱۹۹۴ء

شاکر عثمانی بیگ، پروفیسر، پروفیسر ردو مضمون نویسی وافسانہ نگاری اردو کے قواعد ونمونے، ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور

شاہد حسین رزاقی، سر سید احمد اصلاح معاشرہ، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، ۱۹۶۳

ضیاالدین، لاہور، خود نوشت افکار سر سید، فضلی سنز، پرائیویٹ لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۹۸ء

ضیا الدین، لاہوری، سر سید کی کہانی ان کی اپنی زبانی، اسلامی کتب خانہ، عقب جامع مسجد نیو ٹاؤن، کراچی، ۱۹۸۲ء

ضیاالدین، لاہوری، کتابیات سر سید، مجلس ترقی ادب، کلب روڈ، لاہور، ۲۰۰۸ء

عبد الحق، مولوی، سر سید احمد خان حالات وافکار، انجمن ترقی اردو پاکستان، گلشن اقبال، کراچی

عبد الحق، مولوی، مطالعہ سر سید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۹ء

عبد الحق مولوی، مطالعہ سر سید، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ۱۹۸۴ء

عبد الرحمن بجنوری، ڈاکٹر، محاسن کلام غالب، پبلشرز ڈاکٹر مجید الرحمن، بجنوری ٹرسٹ، اسلام آباد، ۲۰۰۴ء

عمر الدین محمد، پروفیسر، سر سید احمد خان کا نیا مذہبی طرز فکر، ادارہ ثقافت، اسلامیہ کلب روڈ، لاہور

فرمان فتح پوری، ڈاکٹر، اردو نثر کا فنی ارتقا، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

کلیم الدین احمد، اردو شاعری پر ایک نظر، عشرت پبلشنگ ہاؤس، ہسپتال روڈ، انار کلی لاہور،

گارساں و تاسی، بحوالہ ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں، محمد عتیق صدیقی، علی گڑھ، انجمن ترقی اردو ہند دسمبر ۱۹۵۷ء، بار اول

گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، یادگار سرسید، مجلس فروغ تحقیق، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء

گیان چند، ڈاکٹر، تحقیق کا فن، ادارہ فروغ قومی زبان پاکستان، ایس ٹی پرنٹرز گوالمنڈی، راولپنڈی

محفوظ الحق حقی، علی گڑھ کے چار سال، ایشیا پرنٹرز اینڈ پبلی کیشنز، کیمبل روڈ، کراچی، ۱۹۷۰ء

محمد حسین آزاد، "آبِ حیات"، ھجرا انٹرنیشنل پبلیکیشنز، لاہور، س سن

سوزن بیسنٹ، تقابلی ادب: ایک تنقیدی جائزہ، پورب اکادمی، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

نازیہ مختار، عقیل الزماں، خان، صادق ابدالی، سید، مرتبین، اردو کی غیر افسانوی نثری اصناف، ادارہ یادگار غالب، کراچی، ۲۰۱۶

نسیم عباس نیئر، سرسید شناسی کے چند اہم زاویے، ادارہ ثقافت، اسلامیہ، لاہور، ۲۰۰۱ء

Tariq Rehman, A history of Pakistani Literature in English Printed at Intikhaab Jadeed Press, Abbot Road, Lahore.

Fazle-e-Kareem, Sir Syed Ahmed Khan, Re ferance and first protagorist of muslim nationalism composed and printed by compasing centre parrama sadar Karachi.

Francies Bacon, Selected essays, published by New Kitaab Markaz-17, Urdu Bazaar, Lahore.

Sir Francis Bacon, Bacon Essays, published by new Kitaab Mahal & Urdu Bazaars Lahore, Pakistan.

Fulton H. Anderson, Frances Bacon: is career and his thoughts, Unversity of Saufern Calfornia Press, 1962.

Bronwen Price, Francies Bacon's New Athanlis: New Interdiciplinary Essay, Manchester University press 2002.

Peter Urbach, Francies Bacon's Philosophy of Science: an account and a re appraisal open court publishing 1987.

Stephen Gaukroger, Francies Bacon and the transformation of only modern philosophy, Combridge University, Press, 2001.

Virgil K. Whitakar, Francis Bacon's intellectual Milieu Publications from 1910 the clerk library professionalip, UCLA.

Claud J. Summers, Faultlines and controversies, in the study of 7th century English Literature University of Missory Press, 2002.

Noretta Koertge, A House Built on sand; Science, Oxford University Press 1998.

Jillkraye, Humanism and Early Modern Philorophy, Routledge, 2000.

William Lciess: the domination of nature M. C. Gill Queens Univeristy Press 1994.

G. H. R. Pakinson, The renaissance and 7th Century Nationalism, Routledge 1993.

Paul A. Olson, The Kingdom of Sciences, Literary Utopianism and British Education, 1612 to 1870, University of Nibraska Press 2002.

Christophir Baker, Absdutism and the Scientilic revolution, 1600-1720, AD biographical Dictionary, Green Wood Press, 2002.

http://www.gutenberg.net/gutindex.all

رسائل وجرائد:

اخبارِ اردو، ماہنامہ، قومی تاریخی وادبی ورثہ ڈویژن، فروغ قومی زبان، اسلام آباد، اکتوبر۔نومبر، ۲۰۱۷ء

ارتقا، سہ ماہی، ترقی پسند فکر کا ترجمان، علمی وادبی کتابی سلسلہ، شمارہ نمبر ۳۴، ولایت آباد نمبر ۲، منگھ پیر روڈ، کراچی، جنوری تا مارچ ۲۰۰۳ء

دریافت، سالانہ، تحقیقی وتنقیدی مجلہ، شمارہ ۱۰، نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد، جنوری ۲۰۱۱ء

سروش، سروشینز نمبر (خصوصی شمارہ)، گورنمنٹ کالج میرپور، آزاد کشمیر، جلد نمبر ۲۰۶\۴۳۳، شمارہ ۱

قومی زبان، ماہنامہ، انجمن ترقی اردو پاکستان، گلشن اقبال کراچی، جلد ۸۹، شمارہ ۱۰، اکتوبر ۲۰۱۷ء

لغات:

احمد دہلوی، سید، مولوی، فرہنگ آصفیہ (مرثیہ)، اردو سائنس بورڈ، پرمال روڈ، لاہور، ۲۰۰۶ء

وارث، سرہندی، علمی اردو لغت (جامع)، علمی کتاب خانہ، کبیر سٹریٹ، اردو بازار، لاہور ۱۹۹۶ء

John Shekespear, Jchn Shakespeer's Dictionary, Sang-e-Med Publications, Chowk Urdu Bazaar, PO Box 997, Lahore 1996 Chowk Urdu Bazaar, PO Box 997, Lahore 1996.